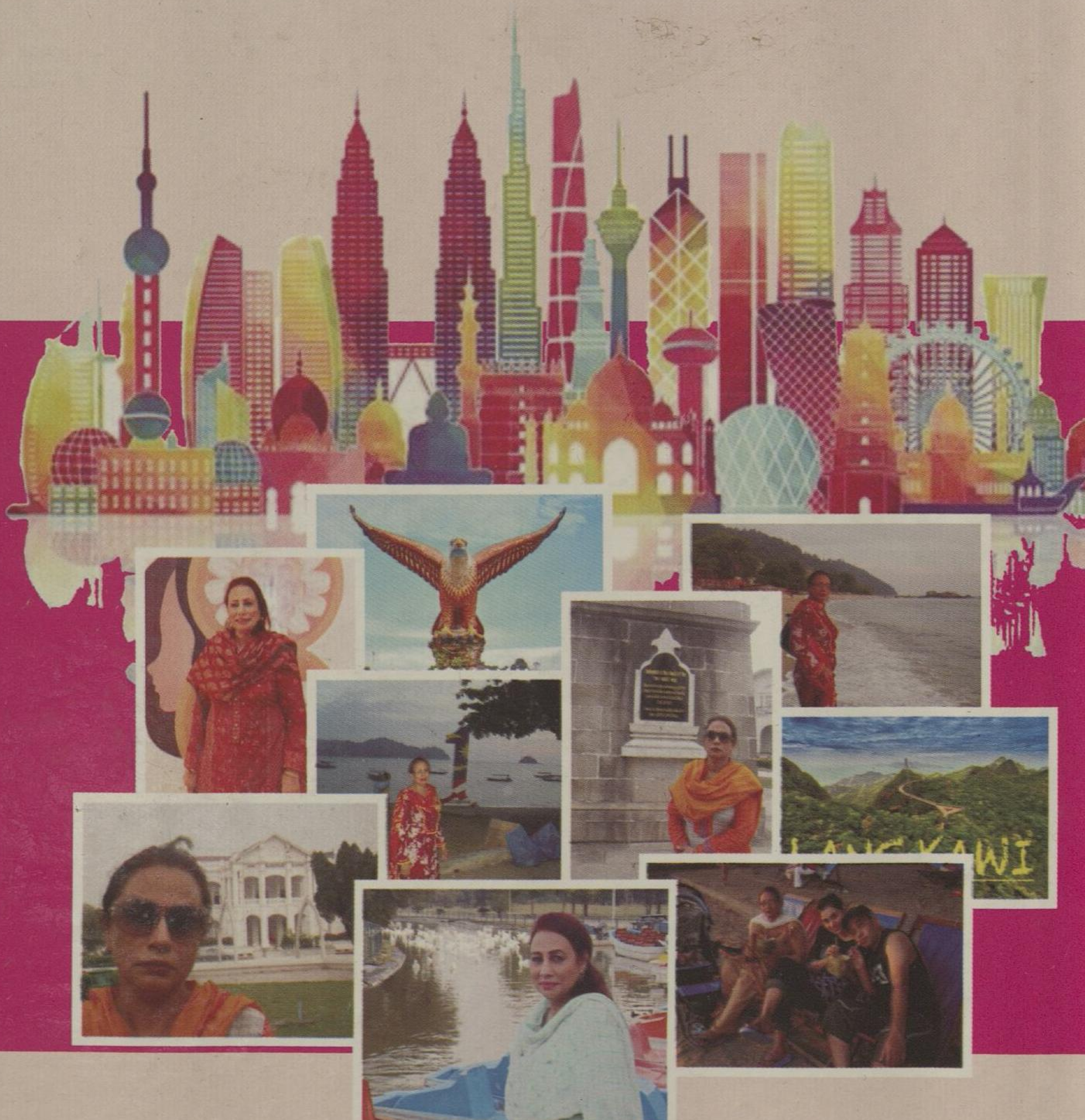
مجھے اُس دیس جانا ہے

(سفرنامہ ملائیشیا)

تسنیم کوثر



مجھے اُس دیس جانا ہے

تسنیم کوثر

اردو اکیڈمی پاکستان، لاہور

تعبیر فاؤنڈیشن، لاہور

نام کتاب : مجھے اُس دیس جانا ہے

مصنفہ : تسنیم کوثر

ناشر : اردو اکیڈمی پاکستان، لاہور

پرنٹر : حاجی محمد حنیف اینڈ سنز، لاہور

اشاعت : ۲۰۲۱ء

قیمت : ۴۰۰ روپے

اس کتاب کی اشاعت کے لیے مالی معاونت اکیڈمی ادبیات پاکستان (اسلام آباد) نے فراہم کی۔

اردو اکیڈمی پاکستان

25 سی لوئر مال لاہور

رابطہ کے لیے:

03334182396

03004669638

اِنتساب

ان دیکھے خواب کے نام

اِنتساب ثانی

اُن پربتوں، آبشاروں، جھیلوں، نیلے
پانیوں، جنگلوں اور جزیروں کے نام
جو تاحیات میری آنکھوں کی
پُتلیوں پہ نقش رہیں گے۔

فہرست

وقت کی تتلی

یہ کب ضروری ہے کہ جو جی چاہے وہی ہو جائے!

کہیں حالات انسان کو الجھائے رکھتے ہیں اور کہیں خوف بہت سے شوق دبا دیتا ہے

مگر۔۔۔

اس ڈر اور خوف کے باوجود ہر انسان سفر ضرور کرتا ہے۔ایک شہر سے دوسرے شہر اور ۔۔۔کبھی دوسرے ملک جا پہنچتا ہے۔

کوئی روزگار کے لیے

کوئی حصولِ تعلیم کے لئے

لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو محبت کے رَتھ پر سوار ہو کر تنہا ہزاروں میل دور کا سفر کر جاتے ہیں۔

محبت وہ مُنہ زور جذبہ جو ناممکن کو ممکن بنا دے۔۔۔

اور ایک ماں کو۔۔۔اپنی اکلوتی بیٹی سے ملنے کی لگن لگا دے۔

مُجھے بھی یہ لگن ہی اس خوبصورت جزیروں والے ہرے بھرے دیس میں لے گئی تھی۔

اس محبت نے ہی مُجھے اس سفر پہ اُکسایا تھا۔

سفر تو پہلے بھی کئی بار کئے تھے۔

بہت سے شہر، ملک دیکھ لئے تھے۔

مگر یوں تنہا۔۔۔۔ ہزاروں میل کا سفر مُجھے اس محبت نے ہی کروایا تھا۔

میں نے ہمیشہ شاندار سنگت والے سفر کئے۔

ہمیشہ محبتوں والے، رونقوں والے ساتھ ملے۔

سفر تو یہ بھی خوشی سے چھلکتا ہوا تھا۔

محبت کے نئے رشتے سے مہکتا ہوا تھا۔

یہ ایک ماں کا محبتوں بھرا سفر تھا۔

مُجھے اس دیس جانا ہے، اسی محبتوں بھرے سفر کی کہانی ہے۔

وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے۔

وقت کے ٹکسال میں ٹھنا ٹھن لمحوں کے سکے ڈھلتے ہیں اور یادوں کی پٹاری میں جمع ہوتے جاتے ہیں۔

یادیں جب لفظوں میں ڈھل جائیں تو کبھی افسانہ اور کبھی سفرنامہ بن جاتی ہیں۔

میں نے بھی وقت کی تتلی کے ریشمی لمس کو لفظوں میں سنبھالا ہے اور ان یادوں کو سفر نامے میں ڈھالا ہے۔

وقت کی تتلی ہاتھ سے نکلی
چھوڑ کے رنگ ہتھیلی پر
لمس ریشمی دل پر جائے
وقت گیا پھر ہاتھ نہ آئے

تسنیم۔۔۔۔ایک اچھی افسانہ نگار

سالوں پہلے کی بات ہے تخلیق کے بانی مدیر اظہر جاوید حیات تھے۔ پرچہ ملا تو ہندوستان کے ایک سفرنامے کا آغاز ہو رہا تھا۔ پہلی قسط ہی ایسی دل موہ لینے والی تھی کہ پڑھ کر تھوڑی دیر تو گم صم ہونے والا سلسلہ ہوا۔ نثر سادگی اور پرکاری کی اپنی مثال آپ تھی۔ توجہ کھینچ کر بتاتی تھی کہ رکو، مجھے پڑھو اور ہاں سراہو بھی۔ مصنفہ کون تھی؟ پڑھا تو تسنیم کوثر پڑھنے کو ملا۔ اس وقت ابھی شناسائی زیادہ نہ تھی۔ ہاں کہیں کسی تقریب میں بس ہیلو ہائے والی بات ضرور تھی۔ پھر جیسے تخلیق کا انتظار رہنے لگا۔ خصوصی طور پر تسنیم کوثر کے سفرنامے کا۔ کیا دل پذیر سا انداز تھا۔ کہیں دلّی کے گلی کوچوں میں لیئے پھرتی تھی۔ کہیں چندی گڑھ کے سبزہ زاروں میں گھما پھرا رہی ہے۔ کہیں شملہ کے پہاڑوں میں پہنچی ہوئی ہے۔ لوگوں سے ملاقاتیں کروا رہی ہے۔ پنجاب کی رہتل اور وسیب کی کہانیاں اپنی ہندوستانی دوستوں کے حوالے سے سنا رہی ہے۔ بات سے بات نکال رہی ہے۔ شگفتہ بیانی سے دلوں میں اُتر رہی ہے۔ محبتیں بانٹ رہی ہے اور انہیں سمیٹ بھی رہی ہے۔ سچی بات ہے جب سفرنامہ اپنے اختتام کو پہنچا اور الحمد والوں نے سفرنامے کو جو" کہانی اُن دنوں کی" کے نام سے چھپ رہا تھا کتابی شکل دی۔ تب اِسے خریدا اور دوبارہ پڑھا اور لُطف اُٹھایا۔

تسنیم ایک اچھی افسانہ نگار بھی ہیں۔ پیشہ وارانہ طور پر کسی این جی او سے منسلک ہیں

جہاں انہیں اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کے سلسلے میں کبھی کبھی بیرونِ ملک جانے کا اتفاق ہوا۔ مصر جانے کا اتفاق بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔اب ایک اور سفرنامہ اپنے قارئین سے داد سمیٹنے کو منظرِ عام پر آ گیا۔سچ تو یہ ہے کہ اِس کی تیز مشاہداتی نظر اور چھوٹی جزئیات کو اپنی تحریر کا حصہ بنانا تسنیم کو خوب آتا ہے۔اُسے قاری کو گرفت میں لینا بھی خوب آتا ہے۔مجال ہے وہ اُسے ہلنے دے۔یہ لکھنے والے کی بڑی خوبی ہے۔

تسنیم کو بہت بہت مبارکباد۔ملائیشیا کے سفرنامے کی میں نے ہر قسط پڑھی ہے اور ہر قسط کے اختتام پر اس کے فن کی مزید گرویدہ ہوتی ہوں۔دعا گو ہوں کہ وہ ایسے خوبصورت سفر نامے تخلیق کرتی رہے۔

سلمیٰ اعوان

میں اور میرا دل

بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔

جی کسی کام میں لگتا ہی نہیں تھا۔ میں اپنی یہ اضطرابی کیفیت سب سے چھپائے ہوئے تھی۔۔۔۔ کسی کو بتانے سے بھی گھبرا رہی تھی کہ۔۔۔۔

یہ ساری علامتیں تو عشق میں ہوا کرتی ہیں۔

عشق؟

عشق۔۔۔۔ اور وہ بھی اس عمر میں؟

مگر! عشق کب پرواہ کرتا ہے کسی کی۔۔۔۔ یہ تو وہ منہ زور دریا ہے جو اپنے رستے میں آنے والی ہر شے کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ میرے من میں بھی عشق کا جوار بھاٹا اُٹھ رہا تھا اور میں۔۔۔۔

اس بحرِ عشق میں غوطے کھانے کو مچل رہی تھی۔

بات ہی ایسی تھی۔

زندگی نے زندگی تخلیق کی تھی۔

جب سے سُنا تھا۔۔۔۔ بے قراریاں کچھ اور بڑھ گئی تھیں۔۔۔۔ دل کی بس ایک ہی رٹ تھی۔ مُجھے جانا ہے۔

مجھے اس دیس جانا ہے۔۔۔۔

مجھے اس دیس جانا ہے۔۔۔۔

سو میں نے۔۔۔۔جی ہی جی میں جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔۔۔۔چپکے چپکے، بڑے بڑے مالز سے چھوٹی چھوٹی چیزیں خرید لی تھیں۔۔۔۔ننھے ننھے فراک بھی لے آئی تھی اور۔۔۔۔محبتوں کے یہ سب تحفے ایک ہینڈ کیری میں سینت کے رکھ دیئے تھے گویا۔۔۔۔

رخت سفر تو باندھ لیا تھا مگر۔۔۔۔

پروگرام کو ابھی صیغہ رُاز میں رکھا گیا تھا۔ سوچا یہی تھا! خیر سے ویزہ، ٹکٹ وغیرہ کے مراحل طے ہو جائیں گے تب ہی سب کو بتاؤں گی۔ پہلے بتا دیا تو۔۔۔۔

صدیقی صاحب گھبرا جائیں گے کہ۔۔۔۔

گھر کیسے چلے گا؟

ہمارا کیا ہوگا؟ کیسے رہیں گے؟ کیا کھائیں گے؟

اُن کا فکر مند ہونا اپنی جگہ درست کہ۔۔۔۔

پہلے جب کہیں جاتی تھی تو میری بیٹی۔۔۔۔گھر کو جنت بنائے رکھتی تھی مگر۔۔۔۔

جب سے وہ اپنے گھر بار کی ہوئی تھی۔۔۔۔میں سب آنا جانا بھول گئی تھی کہ گھر میں۔۔۔۔میرے سوا اور کسی عورت کا وجود تھا ہی نہیں اور۔۔۔۔

میں بھی وہ بٹی ہوئی عورت جو۔۔۔۔صبح سانجھرے اُٹھ کے بھاگتے دوڑتے زندگی کے کام نمٹاتی تھی۔۔۔۔دفتر جاتے ہوئے رستے میں ناخنوں پہ چپکا ہوا آٹا کھُرچ کھُرچ کے اتارتی جاتی تھی اور۔۔۔۔رات گئے کتابوں، رسالوں میں پناہ ڈھونڈتی پھرتی تھی۔

یہ سچ تھا کہ بیٹی کی شادی کے بعد میں بہت تنہا ہو گئی تھی۔

زندگی عجیب بے رونق سی ہو گئی تھی۔۔۔۔سارا دن گھر میں سناٹا گونجتا تھا۔۔۔۔کہیں

وُہ چہکار سنائی ہی نہ دیتی تھی جو۔۔۔اس گھر کا خاصا تھی۔دونوں بیٹے اور۔۔۔میاں صاحب شام ڈھلے گھر لوٹتے اور میں۔۔۔سارا دن گھن چکر بنی گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر تک کے کام نمٹایا کرتی تھی اور چپکے چپکے پلّو میں مُنہ دیئے روتی رہتی تھی کہ۔۔۔چڑیا کی طرح گھر بھر میں چہکنے والی دکھائی جو نہ دیتی تھی۔اپنی لاڈلی۔۔۔اکلوتی بیٹی کی جُدائی مجھے بہت شاق گزری تھی ۔۔۔جانے کتنے ہی آنسو میں نے اسے یاد کرتے ہوئے بہائے تھے کہ وُہ جو۔۔۔تتلی کی طرح میرے گھر میں ہر سو رنگ بکھیرتی رہتی تھی اب۔۔۔

پردیس چلی گئی تھی لیکن جاتے جاتے۔۔۔اپنی بے کل ماں کو ایک ہنر سکھا گئی تھی۔ میرا رونا دھونا دیکھ کے۔۔۔پردیس جاتے ہوئے میری چھوٹی سی بیٹی نے۔۔۔بڑے حوصلے کے ساتھ مجھے سکائپ (SKYPE) کی الف ب سمجھا دی تھی اور میں نے اس سے کوئی خاص رغبت نہ ہوتے ہوئے بھی رٹو طوطے کی طرح یہ سب طریقے ازبر کر لئے تھے اور پھر ۔۔۔

فراغت کے لمحوں میں یہ سکائپ (SKYPE) ہی میری اولین ترجیح ہو گیا تھا۔میں دفتر سے آتے ہی لیپ ٹاپ سنبھالتی اور سکائپ آن کر کے بیٹی سے ڈھیروں باتیں کرتی۔۔۔ جی بھر کے اسے دیکھتی رہتی مگر۔۔۔

اداسی کی برف پھر بھی نہ پگھلتی تھی۔

انہی دنوں (پلاک) پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف لینگویجز اینڈ کلچر میں۔۔۔ایک تقریب میں جو۔۔۔مدیر تخلیق اظہر جاوید نے ڈاکٹر کیول دھیر کے اعزاز میں منعقد کی تھی۔بشریٰ اعجاز نے مجھے اداس دیکھ کے میری اداسی کا سبب جاننا چاہا تھا اور پھر۔۔۔میری پلکوں پہ لرزاں ممتا کے ستارے دیکھ کے کہا تھا۔

تھوڑی ہمت کرلو۔۔۔

مل آؤ بیٹی سے! جی بہل جائے گا اور ۔۔۔۔ یہ اداسی کے بادل بھی چھٹ جائیں گے

تب میں نے بے یقینی سے سوچا تھا کہ

کیسے جا پاؤں گی میں؟

یہ جو بہت سے الجھیڑے اور بکھیڑے مجھے گھیرے ہوئے ہیں ۔۔۔۔ یہ مجھے کہیں نہیں جانے دیں گے ۔۔۔۔ مگر سچی بات یہ تھی کہ ۔۔۔۔

اُسی پل سے جی کے کسی کونے میں اس سفر کی خواہش کی کونپل پھوٹ پڑی تھی ۔ یہ الگ بات کہ ۔۔۔۔ بشریٰ اعجاز کی محبت بھری باتیں اور پیار بھرا دلاسہ مجھے اور غمزدہ کر گیا تھا۔ یاد کی لَو کچھ اور تیز ہوگئی تھی اور پھر جب ایک دن ۔۔۔۔ اظہر صاحب نے سیما پیروز اور قاضی صاحب کے ملائیشیا جانے کی نوید سنائی تھی بس تب سے ۔۔۔۔ میں نے سیما کو سندیسے دینے شروع کر دیے تھے ۔ فون پہ اُن کا پروگرام پوچھتی تھی اور کہتی تھی ۔ دیکھو سیما! اگر تم وقت نکال سکو اور ۔۔۔۔ تمہاری اس سے ملاقات کی کوئی صورت بن جائے اور ۔۔۔۔ تم اس سے مل لو تو ۔۔۔۔

اُسے میری آنکھوں سے دیکھنا!

اُسے اپنی آنکھوں میں بھر لانا!

اور اگر ۔۔۔۔ فاصلے آڑے آجائیں ۔۔۔۔ ملنا ممکن نہ ہو سکے تو اُسے فون کر لینا۔ اُس کی آواز تمہیں سارے بھید بتا دے گی ۔۔۔۔ سیما! میری چھوٹی سی بیٹی تخلیق کے مرحلے سے گزرنے والی ہے ۔۔۔۔ وہ پردیس میں ہے ۔۔۔۔ اکیلی ہے ۔۔۔۔ اُسے حوصلہ دینا ۔۔۔۔ اسے سمجھا دینا مگر ۔۔۔۔

اُسے میری اُداسی کے بارے میں کچھ نہ بتانا ۔۔۔۔ کچھ نہ کہنا ۔۔۔۔ سیما پیروز سے یہ سب باتیں کہتے ہوئے میں رو دی تھی۔

یہ دل کا نگر بھی عجیب ہوتا ہے۔

کبھی تو۔۔۔آپ ہی آپ بنا کسی بات کے مہکے سرخ گلابوں کا مسکن بن جاتا ہے اور کبھی۔۔۔گہری اداسی کی آکاس بیل اسے یوں جکڑ لیتی ہے کہ چاروں اُور بکھرے اُجالے بھی نظر نہیں آتے۔احساسات اور جذبات کی اس نگری میں ایک محبت ہی تو ہے جو۔۔۔خاموشی میں بھی گنگناتی ہے۔میری خاموشی بھی اس روز گنگنانے لگی تھی جب۔۔۔

جاڑے کی نرم گرم دھوپ میں لپٹی ایک چمکدار صبح ارم نے اپنے خوابوں کی تعبیر پائی۔۔۔یہ نوید ملتے ہی میرا باؤلا سا دل پروں کی خواہش کرنے لگا۔۔۔میری دعاؤں کے راہوار بنا کسی پاسپورٹ ویزے کے۔۔۔ہوا کے دوش پہ سرحدیں پار کرتے ہوئے ان کی حفاظت کو چل دیے تھے۔میرے گلشن میں اک کلی کِھل گئی تھی۔۔۔میں تعبیر کو دیکھنے اور ارم سے ملنے کی دعائیں کرنے لگی تھی مگر۔۔۔

یہ سب میرے لئے اتنا آسان کب تھا؟

اسی اضطراب میں جاڑا رخصت ہوا۔۔۔بہار کا موسم بھی اپنی چھب دکھلا کے گرمی کی شدت ہمیں سونپ گیا۔۔۔اس دوران میں نے کئی بار اُڈاری مارنا چاہی مگر۔۔۔بات نہ بن سکی تھی اور۔۔۔

اس بات نہ بننے میں بھی سارا قصور میرا اپنا تھا کہ۔۔۔میں وقت ہی نہیں نکال سکی تھی۔بیٹی کے پاس جانے کی شدید خواہش کے باوجود میں ویزے کے لیے اپلائی ہی نہیں کر سکی تھی کہ۔۔۔جب بھی ذرا سی فرصت ملتی تھی۔میں۔۔۔مواصلاتی رابطے جوڑ بیٹھتی تھی اور۔۔۔وقت کا پتہ ہی نہ چلتا تھا تو پھر۔۔۔

بات کیسے بنتی؟

پردیس جانے کے لیے جو تگ و دو کرنا تھی وہ کون کرتا؟

ویزہ آفس کے چکر، ایجنٹ سے رابطے میرے بس کی بات نہ تھی۔۔۔۔ بچوں کی اور میری ٹائمنگ ہی نہیں ملتی تھی اس لئے۔۔۔۔ دیر ہوتی جا رہی تھی۔ میرے لئے اس مشکل ترین مرحلے کو ایک مہربان دوست نے آسان کرنے کا قصد کیا اور ساری بھاگ دوڑ اپنے ذمہ لے لی۔ میں نے جھٹ رقم اور پاسپورٹ ان کے حوالے کیا اور۔۔۔۔ خود کو اپنے کاموں میں الجھا لیا مگر ۔۔۔۔

دل میں یہی ادھیڑ بن لگی ہوئی تھی کہ۔۔۔۔

جانا ممکن بھی ہو سکے گا یا نہیں؟

دفتر سے چھٹی ملے گی یا نہیں؟

دل ہے میرا اِدھر تو۔۔۔۔ میری جان ہے اُدھر والی کیفیت میں دن گزر رہے تھے کہ ۔۔۔۔ پاسپورٹ بمعہ ویزہ اور ٹکٹ میری دسترس میں آ گیا۔

کام تو یونہی جھٹ پٹ ہوا کرتے ہیں۔۔۔۔ میں نے سوچا!۔۔۔۔ جس کام کو کرنے کیلئے مجھے چار مہینے سے وقت نہیں مل رہا تھا وہ۔۔۔۔ چند دنوں میں ممکن ہو گیا تھا۔ اب تو جانا لازم ٹھہرا تھا مگر۔۔۔۔

دفتری اور گھریلو پل صراط سے گزرنا ابھی باقی تھا۔۔۔۔ گھر کے لئے کوئی انتظام کرنا تھا اور۔۔۔۔ چھٹی کے لیے تگ و دو۔۔۔۔ یہ دونوں ہی کام مشکل تھے۔ چھٹی ملنے کے دور دور تک آثار نہ تھے اور۔۔۔۔ گھر کے لئے اس بے اعتبار زمانے میں، کسی پہ اعتبار کرنا اور اسے گھر کی ہر بات میں شامل کرنا بھی ممکن نہ تھا اور۔۔۔۔ ادھر دل کی یہی رٹ کہ۔۔۔۔

مجھے اس دیس جانا ہے۔

مجھے اس دیس جانا ہے۔

ویزہ، ٹکٹ، پاسپورٹ سب مجھے اس بات کا یقین دلا رہے تھے کہ۔۔۔۔ مجھے سچ مچ

اس دیس جانا ہے جہاں۔۔۔۔

زندگی اپنے گہرے سبز رنگوں کے ساتھ مہربان ہے

جہاں دنیا بھر سے لوگ اس نگر کی خوبصورتی کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔

جہاں پام کے پتوں پہ گرتی بارش کی بوندوں کا جلترنگ من کو سرشار کرتا ہے اور جہاں

۔۔۔۔

میری ارم اپنی رحمت کو بانہوں میں بھرے میرا انتظار کرتی ہے۔

پی آئی اے کے رنگ ڈھنگ

میں اپنوں کے جھرمٹ میں یہاں آئی تھی مگر۔۔۔۔

بورڈنگ کارڈ لیتے ہی ہمارے رستے جدا ہو گئے تھے۔ وہ پلٹ گئے تھے اور میں ۔۔۔آگے بڑھتے ہوئے بھی پیچھے مُڑ مُڑ کر انہیں دیکھے جاتی تھی مگر دیکھ نہیں پاتی تھی ۔۔۔وہ تو لوگوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں کہیں گم ہو گئے تھے کہ

علامہ اقبال انٹرنیشنل ائرپورٹ پر۔۔۔۔

آنے اور جانے والے مسافروں سے کہیں زیادہ ان کے عزیز واقارب کا جمگھٹا تھا جو ۔۔۔رشتے داریاں ۔۔۔رواداریاں اور تعلق داریاں نبھانے کو یہاں آئے ہوئے تھے اور اب ۔۔۔ٹولیوں کی صورت اِدھر اُدھر گھوم پھر کے وقت گزار رہے تھے۔

ائرپورٹ ہو یا ریلوے اسٹیشن!

ان جگہوں پر ہمہ وقت گہما گہمی رہتی ہے۔ یہاں کے در و دیوار ۔۔۔۔ ہر گھڑی خوشیوں کی ان گنت چہکاریں سنتے ہیں ۔۔۔حزن و ملال کے ڈھیروں موتی چُنتے ہیں ۔۔۔۔ بچھڑے ہوؤں کو ملاتے ہیں اور ۔۔۔جُدائی کے رنگ بھی دکھلاتے ہیں۔ میرے اردگرد بھی کہیں قہقہوں کی بارات تھی اور کہیں ۔۔۔اشکوں کی برسات مگر میں ۔۔۔۔ یہ سب قہقہے اور آہیں چھوڑ کے اب وہاں چلی آئی تھی جہاں صرف ۔۔۔مسافروں کی نگری آباد تھی ۔۔۔

جہاں اناؤنسمنٹ کا شور تھا اور اس شور میں ۔۔۔۔ تیزی سے حرکت کرتے ۔۔۔۔ بھاگتے دوڑتے مسافر تھے۔

PK-307 بوئنگ 777 نے رات دس بجے اڑان بھرنا تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ دس بجنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ جی میں یہ گمان کہ ۔۔۔۔ ہمارے ہاں تو پروازیں ۔۔۔۔ ریل گاڑیاں عموماً تاخیر سے آتی جاتی ہیں مگر۔۔۔۔

جہاز کی بروقت روانگی نے میرے گمان کا بُت توڑ دیا تھا۔ اناؤنسمنٹ سنتے ہی میں کسی روبوٹ کی طرح اُٹھی اور ۔۔۔۔ جدھر کا اشارہ ملا تھا ۔۔۔۔ ادھر کو چل دی۔ چلتے چلتے اب میں وہاں آ پہنچی تھی جہاں ۔۔۔۔ اک قبول صورت فضائی میزبان لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ سجائے ۔۔۔۔ یوں بیزاری سے ہمارے استقبال کو کھڑی تھی ۔۔۔۔ جیسے کسی غریب کے گھر بن بلائے مہمانوں کی فوج ظفر موج دھاوا بول دے اور وہ ۔۔۔۔ سراسیمہ دیکھتا رہ جائے۔ اسے دیکھ کے مجھے گورنمنٹ کالج اوکاڑہ کی اپنی کلاس فیلو کلثوم یاد آ گئی۔ کتنا شوق تھا اسے ائر ہوسٹس بننے کا ۔۔۔۔ خلاؤں میں اُڑنے کا ۔۔۔۔ آسمان کی وسعتوں کو چھونے کا مگر۔۔۔۔

اب سے چالیس برس پہلے پی آئی اے کا معیار بہت کڑا ہوا کرتا تھا اور میری وہ دوست ۔۔۔۔ پی آئی اے کے اس معیار پر پوری نہیں اُتری تھی یوں ۔۔۔۔ اس کی ہواؤں میں اُڑنے کی خواہش دل میں ہی رہ گئی تھی اور وہ ۔۔۔۔ اس حسرت ناکام کو دل میں چھپائے پیا دیس سدھار گئی تھی۔

ادھر جہاز نے اڑان بھری ادھر ۔۔۔۔ فضائی میزبان مستعدی سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہو گئیں ۔۔۔۔ ٹرالیاں سرکنے لگیں ۔۔۔۔ مسافروں کی آؤ بھگت شروع ہو گئی ۔۔۔۔ دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہوئے اک ٹرالی ہم تک بھی آ پہنچی ۔۔۔۔ نمکین صورت والی اس فضائی میزبان نے بے جان سی مسکراہٹ کے ساتھ ۔۔۔۔ ایک بدوضع سی

ٹرے میرے اور میری ساتھی لڑکی کی طرف بڑھائی۔

پی آئی اے کی اس خستہ حالی نے جی برُا کر دیا۔ کبھی پی آئی اے کے برتن بہت خوبصورت ہوا کرتے تھے۔۔۔۔ میں نے دیکھا، ٹرے میں دو سلائس، جیم، مکھن اور بدرنگ سی چائے تھی۔

ہائیں یہ کیا؟

وہ ڈنر کہاں گیا؟ جس کا وعدہ تھا ہم سے۔

میں جو سارا دن گھر منگوانے۔۔۔۔ کھانے بنا کے انہیں فریز کرنے اور اپنے پیاروں کی کچھ فرمائشی چیزیں ڈھونڈنے اور خریدنے میں لگی رہی۔ اس مصروفیت میں کھانے کا خیال آیا ہی نہیں تھا۔۔۔۔ اور جب میں تھکا دینے والے سب مراحل سے گزر کر آنکھیں موندے۔۔۔۔ پکے پکائے کھانے کے انتظار میں تھی تو۔۔۔۔ یہ بے ڈھنگا سا ڈنر آ گیا۔

میری ساتھی لڑکی بھی منہ بسور رہی تھی۔ میں نے جھٹ بیگ میں سے اپنا ٹکٹ نکالا۔۔۔۔ بغور اسے دیکھا۔۔۔۔ پھر دوبارہ دیکھا۔۔۔۔ ٹکٹ میں تو ڈنر ہی درج تھا۔۔۔۔ خبر نہیں۔۔۔۔ ہمارے ہاں ڈنر ڈبل روٹی کے چند ٹکڑوں اور چائے مکھن پر مشتمل کب سے ہو گیا؟

میرے وطن عزیز کی ائر لائن کے معیار کو کیا ہوا؟

جی چاہا؟

ائر ہوسٹس کو بلاؤں اور۔۔۔۔ یہ ٹرے اسے واپس تھما دوں مگر۔۔۔۔ بھوک نے بغاوت کر دی تھی۔۔۔۔ میری ساتھی لڑکی بھی بُرا سا منہ بنائے اس روکھے پھیکے ڈنر کے مزے لوٹ رہی تھی۔ اس ڈنر نے ہم دونوں کو ہی ملول کر دیا تھا مگر اس مشترکہ غم نے۔۔۔۔ ہم دونوں کے بیچ کھڑی اجنبیت کی دیوار بھی گرا دی تھی۔ ہماری گفتگو کا آغاز بھی پی آئی اے کی اس روکھی پھیکی تواضع سے ہوا تھا مگر۔۔۔۔ اس سے پہلے کہ تعارفی گتھیاں سلجھتیں۔۔۔۔ جہاز نے قائد

اعظم انٹرنیشنل ائرپورٹ پہ اپنے قدم جما دیے تھے۔

کراچی ---- میری عارضی قیام گاہ کہ ----

یہاں مجھے چار گھنٹے رکنا تھا۔ کیسے گزریں گے یہ چار گھنٹے؟ میں نے سوچا۔ اس شہرِ نگاراں میں تو دور دور تک اب کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو ---- اتنی رات گئے میرے لئے اپنی نیند قربان کرتا ---- مجھے ملنے چلا آتا۔ اتنے بڑے اس شہر میں ڈھیروں عزیز اور رشتہ دار مگر ----

میں پھر بھی تنہا جبکہ ---- میری ساتھی ایشل کے بہت سے عزیز اسے ملنے چلے آئے تھے اور ---- وہ بھی اپنے ان سب ہم عمر عزیزوں میں خوب چہک رہی تھی۔ اٹھکیلیاں کرتی پھر رہی تھی کہ ----

یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے ---- بات بے بات مسکرانے والی ---- قہقہے لگانے والی۔ ہم بھی کبھی ایسے ہی تھے۔

کبھی ہمارے فلک شگاف قہقہے بھی کراچی کی فضاؤں نے سنے تھے ---- جب نت نئی شرارتیں زندگی کا حصہ ہوا کرتی تھیں اور ہم ---- ددھیالی، ننھیالی سب کزنز مل کے خوب رونق لگائے رکھتے تھے جب ---- زندگی سیر سپاٹوں میں بسر ہوتی تھی اور سمندر کی شوریدہ لہروں سے چھیڑ چھاڑ ہمارا محبوب ترین مشغلہ بن گیا تھا مگر پھر ---- آہستہ آہستہ ساتھ چھوٹتے چلے گئے ---- سب اپنی اپنی دنیا میں اُلجھ گئے ---- پھوپھی اماں ---- پھوپھی بیگم نہ رہیں ---- رونقوں والے گھر ویران ہو گئے ---- کسی کو موت کے بے رحم پنجوں نے دبوچ لیا اور ---- کسی کو وقت کے دھارے دور ---- بہت دور لے گئے یوں ---- رشتوں پہ حالات کی گرد جمتی چلی گئی۔

میں تو یہ سب بھولی ہوئی تھی مگر ---- چار گھنٹوں کا یہ قیام مجھے ان دنوں کی یاد دلا گیا

تھا۔۔۔۔ جب دکھ نام کی چڑیا سے ہماری کوئی آشنائی نہ تھی۔۔۔۔ جب زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ہم پہ سایہ فگن تھی۔روشنیوں کے اس شہر سے زندہ دلی کی بہت سی سنہری یادیں وابستہ تھیں اب تو۔۔۔۔وقت نے قہقہے سلب کر لئے تھے۔۔۔۔حالات نے سارے کس بل نکال دیے تھے اور۔۔۔۔چہرے پہ ان گنت لکیروں کا جال سا بن دیا تھا۔اس روز یہ چار گھنٹے ۔۔۔۔میرے لئے بہت طویل ہو گئے تھے جبکہ ایشل (میری ساتھی لڑکی) کے لئے یہ وقت پلک جھپکتے میں بیت گیا تھا۔

اپنوں سے دوری پہ آنکھیں چھلک جایا کرتی ہیں۔

ایشل۔۔۔۔اپنے ساتھی کزنز سے بچھڑنے پہ اداس تھی اور میں۔۔۔۔اپنے بچھڑے ہوئے ساتھی کزنز کے غم میں آزردہ تھی۔اُس کی آنکھوں کے بھیگے کنارے اور۔۔۔۔میری پلکوں پہ چمکتے ستارے ہم دونوں کے۔۔۔۔دلوں کا بھید کھول رہے تھے۔

PK-896 ائر بس 310۔

یہ ائر بس اپنے مسافروں کی منتظر تھی۔ونڈو سیٹ یہاں بھی میری دسترس میں تھی۔عُمر عزیز کے کتنے ہی برس گزر گئے مگر میری پسند اپنی جگہ پر ہی رہی۔۔۔۔یہ نہیں بدلی۔۔۔۔دل اب بھی ونڈو سیٹ کا طلبگار رہتا ہے۔بچپن میں بھی یہی خواہش ہوتی تھی کہ سیٹ کھڑکی کی طرف ملے اور میں۔۔۔۔بھاگتے اشجار اور دوڑتے مناظر آنکھوں میں بھرتی جاؤں۔

بچپن سے پچپن تک اس دل نے اپنی پسند نہیں بدلی تھی۔جہاز تو یہ بھی پی آئی اے کا تھا مگر۔۔۔۔انٹرنیشنل فلائٹ ہونے کی وجہ سے اس کی شان ذرا نرالی تھی۔لاہور سے کراچی تک کے سفر میں ہماری قومی ائر لائن نے اپنے مسافروں کے ساتھ بس واجبی سا سلوک روا رکھا تھا مگر ۔۔۔۔یہی پی آئی اے جب بین الاقوامی پرواز لے کر چلی تو گویا اسے میزبانی کے سارے قرینے آ گئے تھے۔

جونہی جہاز نے فضا میں اپنے پر پھیلائے ۔۔۔ عملہ اپنی پھرتیاں دکھانے لگا۔ خشک ڈبل روٹی کے سلائس کی جگہ ملٹی میل (Multi Meal) سے مسافروں کی تواضع کی جانے لگی۔ خوش رنگ چائے کی مہک اور عمدہ برتنوں کی کھنک نے اشتہا بڑھادی اور ۔۔۔ ہم سب نے اپنی توجہ کھانے کی طرف مبذول کر لی۔ مسافر ملٹی میل سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور سامنے ۔۔۔ نقشے کی نشان دہی کرنے والا ننھا سا تیر انڈیا کی سمت حرکت کرنے لگا تھا گویا ۔۔۔ پلک جھپکتے ہی انڈیا ہمارے جہاز کے پروں کے نیچے آ گیا تھا۔ ہم انڈیا کی فضاؤں سے گزر رہے تھے۔

میں نے سوچا!

دوستی بس سے تو ہمارا انڈیا کا سفر بارہ گھنٹوں پہ محیط ہو گیا تھا۔ تب دوستی بس کا آغاز ہوا تھا اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی خواتین اس پوری بس میں براجمان تھیں۔ صبح پو پھٹنے سے پہلے ہی فلیٹیز ہوٹل کا لاؤنج اور راہداریاں ۔۔۔ مسافر خواتین ۔۔۔ ان کے سامان اور رخصت کرنے والے لواحقین سے بھر گئی تھیں۔ زندگی کا ایک خوبصورت اور یادگار سفر تھا وہ ۔۔۔ جو نرملا دیش پانڈے کی دعوت پہ کیا گیا تھا اور جس کے انمٹ نقوش تقریباً دو دہائیاں گزرنے کے بعد بھی قائم دائم تھے۔

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔

باہر گھپ اندھیرا تھا اور جہاز کے اندر آدھے سوئے ۔۔۔ آدھے جاگے سے مسافر۔ ایشل جاگ رہی تھی۔ میں اور وہ گپ شپ کرنے لگیں اور پھر ۔۔۔ ہمارے درمیان اجنبیت کی دیوار کچھ یوں گری کہ سفر ختم ہو گیا ۔۔۔ ہماری باتیں ختم نہیں ہوئیں۔ کئی گھنٹوں کے اس سفر کے دوران ۔۔۔ تھکن کے باوجود ہم دونوں نے نیند کو قریب نہ پھٹکنے دیا تھا۔ جو باتیں پی آئی اے کی برائیوں سے شروع ہوئی تھیں وہ ۔۔۔ دھیرے دھیرے زندگی کا احاطہ کرنے لگی

تھیں۔

ایشل آنکھوں میں مستقبل کے سنہرے خواب بھرے۔۔۔۔ اپنے لئے لڑکا پسند کرنے کے لئے خانیوال سے کوالالمپور تک کا سفر کر رہی تھی۔ کے ایل میں رہنے والی ایشل کی بہن نے اس کے لئے ایک لڑکا تلاش کیا تھا مگر۔۔۔۔ وہ بنا دیکھے، بنا اس لڑکے سے ملے کوئی رشتہ جوڑنے پر راضی ہی نہ تھی۔ اب اس کے گھر والوں نے اس کی بات مانتے ہوئے اسے اس سفر پہ روانہ کر دیا تھا۔ مجھے ایشل کے گھر والوں کی یہ روشن خیالی اچھی لگی تھی۔ مجھے ایشل کی جرأت مندی بھی پسند آئی تھی کہ۔۔۔۔ بھئی جس کے ساتھ عمر بھر کا سفر طے کرنا ہے۔ اس کے لئے اک چھوٹا سا سفر طے کر کے اسے ملنے۔۔۔۔ اسے دیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مگر ہمارے معاشرے میں تو۔۔۔۔ ہمارے اردگرد اب بھی شادیاں یونہی بنا دیکھے۔۔۔۔ بنا جانے ہی کر دی جاتی ہیں کہ گھر کے بڑے۔۔۔۔ لڑکے اور لڑکی کے شادی سے پہلے ملنے۔۔۔۔ اک دوجے کو دیکھنے دکھانے کو معیوب سمجھتے ہیں۔ حیرت یہ ہے کہ لڑکیوں کو ڈھیروں ڈھیر پڑھا دینے والے۔۔۔۔ ان کی آنکھوں میں روشن مستقبل سجا دینے والے۔۔۔۔ ان کو ملازمت کروانے والے بھی ان کی شادیاں انجان لوگوں سے کر ڈالتے ہیں۔ آدھا تیتر، آدھا بٹیر بنی یہ تعلیم یافتہ لڑکیاں۔۔۔۔ اپنی من مرضی کریں تو باغی کہلائیں اور اگر بڑوں کی مرضی پہ چلیں تو گھُٹ گھُٹ کے مر جائیں۔

میرے اندر چھپی ہوئی۔۔۔۔ انسانی حقوق کی طرفداری کرتی عورت اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی اور ایشل۔۔۔۔ اس بحث میں پورے انہماک کے ساتھ میرا ساتھ دے رہی تھی۔ ہم دونوں باتوں میں اتنی مگن تھیں کہ۔۔۔۔

وقت کے گزرنے اور وقت کے بدلنے کا پتہ ہی نہ چلا۔

جانے کب میں سیاہ گھُپ اندھیرے نے چمکدار روشن صبح کا روپ دھار لیا تھا۔ میں

نے باہر دیکھا۔

چمکدار سنہری دھوپ ---- بادلوں کے آوارہ ٹکڑے اور ---- سینکڑوں فٹ کی بلندی سے نظر آنے والا چھوٹا سا کوالالمپور ہمارا منتظر تھا اور پھر ----

کچھ ہی دیر میں یہ چھوٹا سا شہر بڑا دکھائی دینے لگا۔ بلند و بالا عمارتیں منزل کے قریب ہونے کا پتہ دینے لگیں ---- سڑکوں اور پلوں کے جال دکھائی دینے لگے ---- ہر سمت جھومتے لہلہاتے گہرے سبز پام بھی دھیرے دھیرے قریب آنے لگے اور ٹھیک وقت مقررہ پر ---- دوپہر 11:30 پر جہاز نے کوالالمپور انٹرنیشنل ائرپورٹ کے رن وے کو چھولیا ----

دوران سفر پی آئی اے سے لاکھ شکایتیں سہی مگر ---- میری اس قومی ائرلائن نے پابندئ وقت کو ملحوظِ خاطر رکھ کے میرا دل موہ لیا تھا۔

اب ہم نے اپنی گھڑی کی سوئیاں اس دیس کے وقت کے مطابق کرلی تھیں۔

لمحہ بھر کو میں نے آنکھیں موندلیں تو آخر ----

میں مہاتیر محمد کے دیس میں آگئی تھی۔

مہاتیر محمد ایک ایسا لیڈر ----

جس نے ملک وملت کو مستحکم بنانے کا خواب دیکھا اور پھر ---- ملائیشیا کو ایشین ٹائیگر بنا کے اپنے خواب کی تعبیر پائی ---- ملائیشیا کو دنیا کے نقشے پر ایک مضبوط، منظم اور مستحکم ملک کا حوالہ دیا۔

حکمران ایسے ہی ہوتے ہیں۔

جو حکمران اپنی قوم کو نئے جذبے ---- نئی امنگ ---- نیا ولولہ دیتے ہیں ---- دنیا میں اسے سر اٹھا کر چلنے کے قابل بناتے ہیں ---- زمانہ ایسے حکمرانوں کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔

مہاتیر محمد ایسے ہی حکمرانوں میں سے ہیں۔

جب بھی کوئی ملائیشیا کا نام لیتا ہے۔۔۔۔مہاتیر محمد کو ضرور سراہتا ہے۔۔۔۔میں بھی ملائیشیا کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اس عظیم لیڈر کو خراجِ تحسین پیش کر رہی تھی۔

پام نگری

کوالالمپور انٹرنیشنل ائرپورٹ کی بلوریں عمارت میرے سامنے تھی۔

جس کے لشکارے اور حسین نظارے میرے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کرتے تھے اور مجھے منزل کے قریب ہونے کا یقین دلاتے تھے۔ میرے سامنے برقی سیڑھیاں تھیں۔۔۔۔طویل راہداریاں تھیں۔۔۔۔آراستہ سٹور تھے اور۔۔۔۔پھرتیاں دکھاتے مسافر تھے۔ اس ائرپورٹ کی جدت طرازیاں مجھے اپنی اُور متوجہ کرتی تھیں اور۔۔۔۔مسافروں کی جلد بازیاں زندگی کی تیز رفتاری کا یقین دلاتی تھیں اور یہیں۔۔۔۔

تھوڑے فاصلے پر ایک جدید ٹرین تھی جو۔۔۔۔بل کھاتی پٹڑی پر چلتی ہوئی انٹرنیشنل فلائٹس کے مسافروں کو لاؤنج تک لاتی۔۔۔۔لے جاتی تھی۔ میں اور ایشل بھی لپک کے اس ٹرین میں سوار ہوگئیں۔

کچھ ہی لمحوں میں یہ ٹرین ہمیں لاؤنج تک لے آئی تھی جہاں۔۔۔۔ہر طرف رونقیں اتری ہوئی تھیں اور۔۔۔۔جہاں شادابیاں ہر سو دکھائی دیتی تھیں کہ۔۔۔۔لاؤنج کے بیچوں بیچ سرسبز لہلہاتے ہوئے پودے، ٹرانسپیرنٹ دیواروں سے یوں جھانکتے تھے جیسے۔۔۔۔اس دیس میں آنے والوں کی راہ تکتے ہوں۔۔۔۔بڑھ کے انہیں خوش آمدید کہنا چاہتے ہوں۔ اس شادابی نے لمحہ بھر کو ہمیں روکنا چاہا مگر۔۔۔۔

ہم اک طائرانہ نگاہ ان پہ ڈالتے ہوئے۔۔۔۔ان سے ہیلو ہائے کرتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ گئیں کہ۔۔۔۔اب ہمیں امیگریشن کے لئے لگی لمبی قطاروں میں سے کسی قطار کا حصہ بننا تھا اور یہیں سے۔۔۔۔ہم مسافروں کے رستے جدا ہونا تھے۔ کچھ گھنٹوں کی خوبصورت سنگت اور۔۔۔۔اس سفر کی چہکتی مہکتی یادوں کے ساتھ میں اور ایشل بھی ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے ہوئے امیگریشن کی بھول بھلیوں میں گم ہوگئیں۔

اس جدید ترین ائر پورٹ پہ۔۔۔۔

جہاں ملکی وغیر ملکی جہازوں کی بھرمار تھی اور جہاں۔۔۔۔وقفے وقفے سے جہاز لینڈنگ اور ٹیک آف کا کھیل کھیلتے تھے جہاں۔۔۔۔ہر طرف رنگ رنگ کی ثقافت دکھائی دیتی تھی اور جہاں سے۔۔۔۔

صرف چند قدموں کے فاصلے پر وہ تھی۔۔۔۔

جس کی چاہت مجھے ہزاروں میل دور۔۔۔۔بھارت اور بنگلہ دیش سے بہت آگے جنوب مشرق کی طرف۔۔۔۔ہند چینی کے جنوب میں جزیرہ نما خشکی کی پٹی تک لے آئی تھی۔ اس پٹی کے مشرق، مغرب اور جنوب میں تو نیلگوں سمندر ہے جب کہ۔۔۔۔شمال میں تھائی لینڈ کے ساتھ جڑی یہ پٹی جزیرہ نما ملایا کہلاتی ہے۔

اس جزیرہ نما ملایا۔۔۔۔

یعنی ملائیشیا کے ٹوِن ٹاور والے شہر کے جدید ترین ائر پورٹ کے اسی لاؤنج میں ۔۔۔۔بیریئر کے دوسری طرف میری بیٹی۔۔۔۔اپنی بیٹی اور اپنے شریکِ حیات کے ساتھ ۔۔۔۔جانے کب سے اپنی ماں کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس ماں کے انتظار میں۔۔۔۔جس کا بیٹی کی رخصتی کے بعد کہیں جی لگتا ہی نہ تھا۔ تب انڈین شاعر منور رانا کا یہ شعر جیسے میری اداسی کا ترجمان بن گیا تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ جیسے ختم مسیلہ ہو گیا

اڑ گئیں آنگن سے چڑیاں گھر اکیلا ہو گیا

اور اب کتنے ہی مہینوں کے بعد اسے ملنے۔۔۔۔ اسے دیکھنے کے تصور نے مجھے مہکا دیا تھا۔ دل کا موسم سرخ گلابوں کی طرح کھل اٹھا تھا کہ۔۔۔۔ خوشیاں تو دل کے نہاں خانوں سے پھلجھڑی کی طرح چھوٹتی ہیں اور۔۔۔۔ جلترنگ بن کے فضاؤں میں بکھر جاتی ہیں۔

امیگریشن کے مراحل سے نمٹنے کے بعد۔۔۔۔ پھلجھڑی کی طرح چھوٹتی بکھرتی اس کیفیت کے ساتھ۔۔۔۔ میرے قدم اب تیزی سے اس بیریئر کی طرف اٹھنے لگے تھے جہاں میرے اپنے۔۔۔۔ میرے منتظر تھے۔

اور پھر۔۔۔۔ فاصلے سمٹ گئے۔

میری لاڈلی نے۔۔۔۔ جب اپنی لاڈلی کو بانہوں میں بھرے اپنی ماں کو گلے لگایا تو جیسے۔۔۔۔ دریاؤں کے بند ٹوٹ گئے تھے۔ دور کہیں اک پرانے گیت کی بازگشت سنائی دینے لگی تھی۔

مانواں دھیاں ملن لگیاں

چاروں کنداں نے

چوبارے دیاں ہلیاں

اس بلوریں ائرپورٹ پہ تو آنسوؤں کی اس برسات سے کوئی ہلچل نہ مچی تھی البتہ۔۔۔۔ کچھ آنسو چھلک کے۔۔۔۔۔۔ ارم کی گود میں سمٹی ہوئی تعبیر کو مُضطرب کر گئے تھے۔ وہ کسمسائی۔ میرے گلشن کی پہلی کلی نے اپنی گول گول آنکھیں گھمائیں اور ہم ماں بیٹی کے ملن کا یہ منظر اپنی آنکھوں میں بھر لیا۔

ائرپورٹ کا اندرونی ماحول تو خاصا ٹھنڈا ٹھار تھا مگر۔۔۔۔۔۔ باہر تیز چلچلاتی دھوپ

نے ہمیں جھلسا کے رکھ دیا تھا۔ بچپن میں پڑھی ہوئی اسماعیل میرٹھی کی نظم کا یہ مصرع یاد آ گیا

بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ

جب تک افضال (میرے داماد) گاڑی نکال کے پلٹے۔۔۔۔ یہ حبس زدہ موسم خاصا شرابور کر گیا تھا۔ میں نے اس ائرپورٹ کی عمارت پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔۔۔۔ جس کے اندر ٹھنڈک اور باہر تپش کا بسیرا تھا۔

اب ہمارا اگلا سفر شروع ہونے کو تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے حسبِ عادت اپنی آنکھیں گاڑی کے شیشے پہ رکھ دیں۔۔۔۔۔۔ ٹریفک کا ازدحام تھا مگر۔۔۔۔۔۔ ٹریفک رُکی ہوئی نہیں تھی کہ یہاں۔۔۔۔ سڑکوں کا اک جال بچھا تھا اور ہم ایک فلائی اوور سے اترتے تو دوسرا فلائی اوور دکھائی دیتا تھا۔ سڑکیں کشادہ تھیں اور ان کے دورویہ جھومتے پام۔۔۔۔ اس ملک کی زرخیزی کا پتہ دیتے تھے۔ جدھر نظر جاتی تھی۔۔۔۔ بلند و بالا عمارتیں اور ہریالی اپنی جانب متوجہ کرتی تھی۔ گاڑی اب ہائی وے پر دوڑنے لگی تھی اور اس دوڑتی ہوئی گاڑی کے ساتھ جیسے سارے منظر ہی دوڑے چلے جاتے تھے۔ میں ان سرسبز و شاداب پام کے درختوں کو جھومتا دیکھتی تھی اور۔۔۔۔۔۔ ان کا موازنہ اپنے ملک کے۔۔۔۔ اپنے شہر کے ان قدیم درختوں سے کرتی جاتی تھی جنہیں۔۔۔۔۔۔ گزشتہ دہائیوں میں نہایت سفا کی کے ساتھ ختم کر دیا گیا تھا۔

میں نے سوچا!

کبھی ہمارا لاہور بھی باغوں اور درختوں کا شہر ہوا کرتا تھا۔ جس کی سڑکوں کے دونوں طرف گھنے سایہ دار درخت ہر آتے جاتے راہی پر اپنی چھاؤں نچھاور کیا کرتے تھے۔ اَسّی کی دہائی کے آخری برسوں میں جب میں عاصمہ جہانگیر کے ادارے سے وابستہ ہوئی تب۔۔۔۔۔۔ جیل روڈ سے مین بلیوارڈ پہ آتے ہی درختوں سے ڈھکی یہ سڑک شدید گرمی میں بھی روح کو تازگی بخشتی تھی۔۔۔۔ اور فرحت بخش ٹھنڈک کا احساس دلاتی تھی مگر۔۔۔۔۔۔ پھر ہم

نے ترقی کر لی اور۔۔۔۔۔۔

اس ترقی کے لیے قدیم، گھنے سایہ دار درخت قربان کر دیے گئے۔۔۔۔۔۔پر سکون رہائش گاہیں بڑے بڑے پلازوں میں ڈھل گئیں۔۔۔۔۔۔فاسٹ فوڈ چین اور شاپنگ سنٹر وجود میں آ گئے۔۔۔۔۔۔کثیر المنزلہ عمارتیں بنتی چلی گئیں اور ان عمارتوں کے مکین دور۔۔۔۔بہت دور بستیوں میں نئے گھر بنانے لگے۔۔۔۔۔۔زرعی زمینیں، پلاٹوں کا روپ دھار کے مہنگے داموں فروخت ہونے لگیں یوں۔۔۔۔۔۔درخت کم ہوتے گئے اور ہمارا یہ لاہور شہر پھیلتا چلا گیا۔بغیر کسی پلاننگ کے ہی یہ خوبصورت شہر چاروں اور پھیلنے لگا اور۔۔۔۔۔اب تک پھیلتا ہی جا رہا ہے۔

کون اس بے ہنگم پھیلاؤ کو روکے؟

کون اس خوبصورت تاریخی شہر کی حدود متعین کرے؟

کہ حکمران تو بھاری قرضے اُٹھا کے شاہ خرچی کرتے پھرتے ہیں اور ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبی عوام۔۔۔۔کراہتی رہتی ہے۔

جی میں آئی! کاش میرے ملک کو بھی مہاتیر جیسا لیڈر نصیب ہو جو۔۔۔۔۔۔صرف اور صرف پاکستان کی بھلائی چاہے۔۔۔۔جو صرف پاکستان کی بہتری کے لیے سوچے۔

گاڑی کے رکنے نے میری سوچوں کو منتشر کر دیا۔

"نواس ماجو" پہ گاڑی رُک گئی تھی۔

ایک بڑی سی عمارت پہ یہ نام پڑھ کے میں نے سوالیہ نظروں سے بچوں کو دیکھا۔ افضال نے وضاحت کی! ابھی ہمیں کچھ گھنٹے اور سفر کرنا ہے۔سو چا یہاں کچھ ریفریشمنٹ کر لیں۔

تو یہ۔۔۔۔۔۔نواس ماجو؟ میں نے پوچھا

ماں جی! یہ ملّے زبان کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ہے "اللہ کی رحمت"۔

افضال کئی برسوں سے یہاں مقیم ہونے کی وجہ سے مجھے گائیڈ کر رہے تھے۔ یہ پاکستانی ریسٹورنٹ ہے۔اس کا کھانا بہت لذیذ ہوتا ہے۔

کھانا واقعی مزیدار تھا اور پھر۔۔۔۔۔۔اپنے پیاروں کی سنگت نے اس کھانے کو اور بھی مزیدار بنا دیا تھا۔تعبیر میری گود میں اٹھکیلیاں کر رہی تھی اور میں۔۔۔۔۔۔خود سے جڑے اس نئے رشتے کی قربت سے مہک رہی تھی۔ مجھے اپنی اس "نواس ماجو" پہ پیار آنے لگا۔

ہم "اللہ کی رحمت" یعنی نواس ماجو سے مستفید ہو کر نکلے تو باہر موسم اپنے تیور بدل چکا تھا۔گھنگھور کالی گھٹائیں نیلگوں آسمان کا طواف کر رہی تھیں۔ چمکتے دن پہ رات کا گمان ہونے لگا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چھاجوں مینہ برسنے لگا مگر۔۔۔اس شدید بارش میں بھی گاڑی سرمئی سڑک پہ دوڑے جا رہی تھی۔ بارش کی بوندیں برستی تو دکھائی دیتی تھیں مگر۔۔۔۔۔۔پانی کہیں رُکتا نہیں تھا۔سڑکیں گیلی ضرور تھیں مگر۔۔۔۔۔۔پانی ٹھہرا کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔موسلا دھار بارش نے موسم خوشگوار کر دیا تھا۔

میں نے دیکھا، نیلے دُھلے ہوئے آسمان پر قوس وقُزح کی رنگ دار پٹی ذرا دیر کو ابھری اور پھر چند ثانیے۔۔۔نیلگوں آسمان پہ دھنک بکھیر کے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

موسم نے اپنی چھب دکھلا دی تھی بلکہ۔۔۔۔۔۔ایک ریاست سے دوسری ریاست میں آنے تک یہ آنکھ مچولی کھیلتا موسم۔۔۔ہمارے ساتھ ساتھ ہی تھا کہیں اچانک گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا اور کہیں۔۔۔۔۔۔

دھوپ کی چادر تن جاتی اور اس چلچلاتی دھوپ کی تپش۔۔۔ائر کنڈیشن گاڑی میں بھی خوفزدہ کر جاتی تھی۔سنا تھا! یہاں دھوپ اور بادلوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پہلے دن ہی موسم کے یہ رنگ میرے سامنے آ گئے تھے۔

کئی گھنٹے کے سفر کے بعد ہم۔۔۔ملائیشیا کی ریاست پیراک پہنچ گئے تھے۔ پیرا

ک۔۔۔ملائیشیا کی 13 ریاستوں میں سے ایک اہم ریاست ہے جو۔۔۔کوالالمپور سے تقریباً 205 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ٹن (TIN) کے ذخیرے دریافت ہونے کے بعد اس ریاست کو پذیرائی نصیب ہوئی تھی۔ہم پیراک اسٹیٹ کے دارالخلافہ ایپوہ(IPOH) سے اب ڈسٹرکٹ سری اسکندر جارہے تھے جہاں سے۔۔۔ہمیں ٹرونو مائنز جانا تھا۔

گو سفر خاصا طویل ہوگیا تھا مگر۔۔۔تھکن پاس نہیں پھٹکی تھی کہ۔۔۔گام گام جھومتے ہوئے پام اور بارش سے دُھلے ان کے نکھرے پات آنکھوں کو تراوٹ بخشتے تھے اور ۔۔۔جی سرشار کر جاتے تھے۔دل اس ملک کی ہریالی پہ رشک کرتا تھا اور۔۔۔پل پل اپنے پاکستان کی شادابی کی دعائیں مانگتا تھا۔۔۔گاڑی فراٹے بھرتے ہوئے آگے بڑھتی تھی اور میں۔۔۔

کبھی سوئی۔۔۔کبھی جاگی کسمساتی ہوئی تعبیر کو اپنی گود میں دُبکائے یہ سوچتی تھی کہ ۔۔۔محبت انسان کو کہاں سے کہاں لے آتی ہے۔۔۔یہ کسی رنگ میں ہو۔۔۔کسی روپ میں ہو۔۔۔زور آور ہوتی ہے۔ناممکن کو ممکن بنادیتی ہے تبھی تو میں۔۔۔تنہا ہزاروں میل کا سفر طے کر کے یہاں چلی آئی تھی۔

سورج کا نارنجی کٹورا گہرے سرمئی بادلوں کی آغوش میں دبکنے کو تھا۔ہم مختلف شہروں ۔۔۔قصبوں۔۔۔میدانوں۔۔۔جنگلوں اور ٹیلوں سے ہوتے ہوئے اب اس سڑک پہ آ پہنچے تھے جس پر۔۔۔ٹرونو مائنز (Tronoh Mines) کا بورڈ لگا ہوا تھا اور۔۔۔جس کے ساتھ ہی ایک اور کشادہ سڑک نکلتی تھی جو۔۔۔تامن تاسک پُترا (Taman Tasik Putra) کو جاتی تھی۔کار اس سڑک پہ آئی تو۔۔۔بیریئر خود کار سسٹم کے تحت کار کو راہ دینے لگے۔بس یہی وہ سڑک تھی اور اس اندر اترتی سڑک میں۔۔۔یہی وہ بستی تھی جہاں دو پریمیوں نے اپنا آشیانہ بنایا ہوا تھا۔

صاف ستھری ۔۔۔۔ہری بھری بستی ۔۔۔۔جس کی کشادہ سڑکیں اس بستی کی کشادگی کا پتہ دیتی تھیں ۔۔۔۔ان سڑکوں کے دونوں طرف ۔۔۔۔ایک ہی طرز کے نئے تعمیر کردہ یک منزلہ چھوٹے چھوٹے اپارٹمنٹ تھے جو ۔۔۔۔دور دیس میں آ بسنے والوں کا ٹھکانہ تھے۔ یہاں پہ ہر اپارٹمنٹ کے سامنے گیراج اور چھوٹا سا باغیچہ دکھائی دیتا تھا اور ۔۔۔۔صاحب خانہ کے ذوق کا اظہار کرتی ان باغیچوں کی سجاوٹ ۔۔۔۔راہ چلتوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی تھی۔کار چلتی جاتی تھی۔سڑک آپ ہی آپ مڑتی جاتی تھی مگر ۔۔۔۔سڑک کے بدلنے سے منظر نہیں بدلتا تھا کہ ۔۔۔۔یہاں سب گھر ایک جیسے تھے۔بناوٹ اور سجاوٹ ایک سی تھی۔

ہماری کار 15-Taman Tasik Putra, Tronoh Mines پہ رُک گئی تھی

میں نے دیکھا ۔۔۔۔

گیٹ لگے ساتھ اپارٹمنٹ کے باغیچے میں قطار در قطار پام کے ننھے مُنے پودے ۔۔۔۔اپنی مُندی مُندی آنکھوں سے مجھے دیکھتے تھے اور ۔۔۔۔خوش آمدید کہتے ہوئے جھومتے جاتے تھے۔

میں نے جونہی اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کو قدم بڑھائے ۔۔۔۔سامنے آویزاں جلی حروف نے مُجھے نہال کر دیا۔

WELCOME AMMI JAN

میں نے اس رومانوی جوڑے کو دیکھا ۔۔۔۔دل ہی دل میں نظر اُتاری۔

یہ جلی حروف میرا لہو گرماتے تھے اور ۔۔۔۔مجھے بتاتے تھے کہ

محبت کا مسکن وفا کا ٹھکانہ

یہی میری جنت کا ہے آشیانہ

پردیس میں دیس

شہر کے ہنگاموں سے دور۔۔۔۔ٹریفک ازدحام سے پرے۔۔۔۔گھنے جنگلوں کے بیچوں بیچ۔۔۔۔ٹن (TIN) کی کانوں کے گھیرے میں۔۔۔۔ربڑ اور پام کے درختوں کے جھنڈ میں۔۔۔۔پرندوں اور تتلیوں کے جھرمٹ میں۔۔۔۔سٹیل اور کنکریٹ سے بنی یونیورسٹی ٹیکنالوجی پٹروناس (UTP) کی عمارت دور سے ہی لشکارے مارتی تھی اور۔۔۔۔نگاہوں کو خیرہ کرجاتی تھی۔

یونیورسٹی ٹیکنالوجی پیٹروناس

وہ جگہ تھی جہاں خاموشی گنگناتی ہے اور دل کے تاروں کو چھیڑ۔۔۔۔چھیڑ، جاتی ہے۔اسی گنگناتی ہوئی خاموشی میں۔۔۔۔سورج ڈھلنے سے کچھ پہلے ہم یہاں آئے تھے کہ۔۔۔۔کل کا پورا دن تو یادوں کی پٹاری کھولنے اور اک دوجے کو آنکھوں میں بھرنے میں گزر گیا تھا اور اب افضال کے آتے ہی ہم اس یونیورسٹی کی زیارت کو چلے آئے تھے۔

ریاست پیراک کے دارالخلافہ ایپوہ (IPOH) کے ڈسٹرکٹ سری اسکندر میں ٹرومائنز (Trono Mines) کے درمیان (Tin Mines) قلعی کے ذخائر اور گھنے جنگلات کے وسط میں یونیورسٹی ٹیکنالوجی پیٹروناس بڑی تمکنت سے قدم جمائے ہوئے تھی۔ اس یونیورسٹی کو پیٹروناس کمپنی نے گیس اور ٹن کے ذخائر کی ریسرچ کے لیے بنایا تھا۔

1990 ایکڑ رقبے پر پھیلے ہوئے گھنے جنگلات کو صاف کر کے اس یونیورسٹی کی بنیاد رکھی

گئی تھی۔ 1997ء میں یہاں تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا اور۔۔۔ملائیشیا کو ٹائیگر آف ایشیا بنانے والے عظیم لیڈر۔۔۔۔

مہاتیر محمد اس یونیورسٹی کے پہلے چانسلر مقرر ہوئے تھے۔

مختلف ممالک۔۔۔مختلف مذاہب اور مختلف تہذیب وثقافت سے تعلق رکھنے والے طلبہ اس یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہیں۔ ملائیشین گورنمنٹ دنیا بھر کے ممالک سے ذہین ترین طلبہ کو قابلیت کے بل بوتے پہ اسکالرشپ دے کے یہاں بلاتی ہے۔اس وقت بھی پینتیس ممالک کے طلبہ اس یونیورسٹی میں اپنا مستقبل بنانے کے لیے موجود تھے۔ افضال بھی اسکالرشپ پر یہاں آئے تھے۔ پاکستانی ریسرچرز کی ایک بڑی تعداد۔۔۔اس یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھی۔ جو چھڑے چھٹانک تھے وہ۔۔۔یونیورسٹی کے ہاسٹل میں مقیم تھے اور جو طالبِ علم۔۔۔اپنے کنبے ساتھ لائے تھے وہ یونیورسٹی کے آس پاس کی بستیوں میں آباد تھے۔

ٹرونو مائنز (Tronoh Mines) میں زیادہ تر کنبے والے لوگ رہائش پذیر تھے۔

سری اسکندر۔۔۔۔ جو کبھی چھوٹا سا غیر معروف قصبہ تھا۔ اس یونیورسٹی نے اس کو معروف اور بہت اہم بنا دیا تھا۔ اس قصبے کے ساتھ متصل۔۔۔چھوٹے چھوٹے گاؤں بھی جدید بستیوں کا روپ دھار گئے تھے۔۔۔ویرانہ آباد ہو گیا تھا اور۔۔۔دور دیس سے آئے طالبعلموں کو ٹھکانے میسر آ گئے تھے۔

یونیورسٹی ٹیکنالوجی پیٹروناس ان آبادیوں کے وسط میں ہے۔اس کے دائیں طرف ۔۔۔بندر یو کا علاقہ ہے جہاں پرانے، خستہ حال اور سیلن زدہ سے گھر ہیں ہمارے اندرون شہر کی طرح جہاں۔۔۔دھوپ کا گزر کم ہی ہوتا ہے۔ یہ گھر ساتھ ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔اس علاقے میں زیادہ تر مسلمان فیملیز رہتی ہیں۔ بہت سے پاکستانی بھی یہاں آباد ہیں۔اس نسبت سے یہاں ایک گلی پاکستانی سٹریٹ کہلاتی ہے جبکہ۔۔۔ٹرونو مائنز ایک جدید بستی ہے جس میں

سارے گھر یک منزلہ ہیں ۔۔۔ ہر گھر دو سڑکوں کا سہارا لئے ہوئے ہے۔ کسی گھر کی پشت دوسرے گھر سے متصل نہیں۔ سب ایک ہی طرز کے بنے ہوئے ہیں، روشن اور ہوادار ۔۔۔ ہمارے لاہور کی نئی بستیوں کی طرح ۔۔۔ ہمارے پوش علاقوں کے گھروں کا حدود اربعہ تو خاصا تجاوز کیا ہوا ہے۔ جبکہ یہاں چھوٹے چھوٹے گھر مکینوں کی ۔۔۔ ہر ضرورت اور سہولت کو مدنظر رکھ کے بنائے گئے ہیں۔ ہر گھر میں گیراج ۔۔۔ باغیچہ ہے اور اس باغیچے کی چھوٹی چھوٹی دیواریں امن کی گواہی دیتے ہوئے کہ یہاں چوری چکاری کا خطرہ نہیں حالانکہ ۔۔۔

یہ بستی چاروں طرف سے جنگل اور ٹن مائنز میں گھری ہوئی ہے یہاں ڈر اور خوف کا ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں مگر ۔۔۔

یہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔

اس کا اندازہ مجھے یوں ہوا کہ ۔۔۔ یہاں پہنچ کے رات دیر تک جاگتے رہنے کے باوجود میں صبح سویرے ہی اٹھ بیٹھی تھی ۔۔۔ کبھی صبح سویرے اٹھنا کتنا مشکل لگتا تھا؟ میں نے سوچا! تب بڑوں کی ڈانٹ بھی کچھ اثر نہ کرتی تھی ۔۔۔ باوجود کوشش کے بھی نیند بھری آنکھیں کھلتی ہی نہ تھیں اور اب ۔۔۔ برسوں سے یہی وطیرہ ہے کہ

پو پھٹنے سے پہلے ہی نیند دغا دے جاتی ہے مکر بھر کے ۔۔۔ آنکھیں موندلوں تب بھی نیند لوے نہیں لگتی۔

میں اپنے کمرے سے باہر آئی تو ۔۔۔ اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں خاموشی اتری ہوئی تھی ۔۔۔ بچے اپنے کمرے میں سو رہے تھے، میں ٹی وی لاؤنج میں آ گئی ۔۔۔ پردہ سرکایا تو ۔۔۔ سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔

جی چاہا ۔۔۔ کہ باہر جاؤں اور ۔۔۔ اس چھوٹے سے باغیچے میں کھڑی ہو کے ملائیشیا کی سرزمیں پر نمودار ہوتی ہوئی اپنی پہلی صبح کا رنگ آنکھوں میں بھرلوں۔

مگر کیسے؟

مین دروازہ تو بند تھا اور چابی خبر نہیں انہوں نے کہاں رکھی ہو گی؟

تو یہ بند دروازہ کیسے کھلے؟

یہ سوچتے ہوئے میں نے غیر ارادی طور پر ہینڈل گھمایا تو حیرت سے میری آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ دروازہ لاک نہیں تھا جبکہ۔۔۔۔

ہم تو ڈبل لاک لگا کر بھی خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں کہ۔۔۔۔ غیر مطمئن ملکی فضا، دہشت گردی، دھوکہ دہی اور چوری چکاری نے ہمیں بے اعتبار سا کر دیا ہے۔ کبھی ہمارے ہاں بھی گھر کے دروازوں پہ تالے کا رواج نہیں تھا۔ لوگ اکثر باہر گلیوں میں۔۔۔۔ اپنے گھروں کے باہر چار پائیاں بچھا کے سو جاتے تھے۔ گھروں کے کواڑ بند نہیں ہوتے تھے کہ تب۔۔۔۔ خوشیاں اور غم سانجھے ہوا کرتے تھے مگر۔۔۔۔

پھر ہم انارکی میں ایسے گھرے کہ۔۔۔۔ ایک دوسرے پر اعتبار کرنا ہی چھوڑ دیا۔۔۔۔ ہر ایک کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

تو اس خوبصورت بستی میں جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ میں نے سوچا!

باہر فضا میں سکوت تھا۔۔۔۔ سڑک پہ خاموشی تھی۔۔۔۔ بہت سے مسکن اندھیرے میں ڈوبے تھے۔ کسی کسی اپارٹمنٹ میں پھیلی روشنی۔۔۔۔ اس گھر کے مکینوں کی بیداری کا پتہ دیتی تھی۔ اس پرسکون سناٹے میں کوئی گاڑی گزرتی تو یوں لگتا۔۔۔۔

جیسے کوئی الھڑ دوشیزہ نپے تلے انداز میں دبے پاؤں عشق کی منزلیں طے کرنے چلی ہو۔

یونیورسٹی ٹیکنالوجی پیٹروناس میرے سامنے تھی۔ ڈوبتے سورج کی لالی نے تا حد نظر اسے بھی شفق رنگ کر رکھا تھا۔ گھنے درخت، دُھلے نکھرے پات، شام کی خنک ہوا اور بولتی ہوئی

خاموشی، اِکا دُکا آتی جاتی بے آواز گاڑیاں اور جاگنگ ٹریک پہ جاگنگ کرتے ہوئے طلبہ و طالبات، یونیورسٹی کا حسن بڑھا رہے تھے۔قریب ہی ایک مصنوعی جھیل تھی۔مچھلیاں جس میں غوطے لگاتی ۔۔۔۔ مچلتی پھڑ پھڑاتی سرمستیاں کر رہی تھیں ۔جھیل کے قریب ہی کچھ ریک (Rack) پڑے تھے۔جن کے خانوں میں مچھلیوں کی خوراک کے پیکٹ قرینے سے لگے تھے اوران کے پاس ایک (Money Box) رکھا ہوا تھا۔میری بیٹی نے وہاں سے دو پیکٹ اٹھا لئے اور 10 رنگٹ (ملائیشین کرنسی) اس منی بکس میں ڈال دیے۔میں نے دیکھا۔۔۔۔ یہاں آنے والے سب ایسا ہی کر رہے تھے۔لوگ آتے تھے۔۔۔۔ پیکٹ اٹھاتے تھے اور پیسے منی بکس میں ڈال کے۔۔۔۔مچھلیوں کو خوراک کھلانے لگتے تھے۔

ہمارے ہاں اگر یہ سسٹم ہوتا۔۔۔۔میں نے سوچا۔۔۔۔تو شاید کچھ بھی نہ بچتا۔۔۔۔

نہ منی بکس۔۔۔۔

نہ خوراک کے پیکٹ اور۔۔۔۔

نہ ہی یہ تھرکتی مچلتی مچھلیاں۔

ارم مچھلیوں کو خوراک ڈال رہی تھی اور میں ۔۔۔۔ان مچھلیوں کی اٹھکیلیاں دیکھ رہی تھی۔سرمئی ۔۔۔۔ چمکیلی۔۔۔۔ لپکتی جھپکتی مچھلیاں جھیل کے شفاف پانی سے سر نکالتیں۔۔۔۔ خوراک سمیٹتیں اور جھٹ غوطہ لگا جاتیں اور۔۔۔۔ان کی ڈبکیاں جھیل کے پانی میں دیر تک ہلچل مچائے رکھتیں۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔

اب یہاں ملگجا اندھیرا تھا اور۔۔۔۔ ہر طرف خامشی کا ڈیرہ تھا لیکن۔۔۔۔ مسجد النور میں اس وقت نور کا بسیرا تھا۔

مسجد النور MASJID-AN-NUR

پانی پہ کھڑی یہ مسجد۔۔۔۔پانی پہ اپنے جلوے بکھیر رہی تھی۔مردوزن کی خاصی تعداد اس مسجد میں موجود تھی۔مغرب کی نماز ادا کی جا رہی تھی۔خواتین کے لئے بنائے گئے کیبن میں بہت سی عورتوں کو دیکھ کر مجھے لگا کہ یہاں۔۔۔۔خواتین کی اکثریت مساجد ہی میں نماز ادا کرتی ہے۔میں نے اپنے ہاں عورتوں کو یوں نماز پنجگانہ کے لئے مساجد میں نہیں دیکھا تھا۔ ہمارے ہاں تو عیدین اور جمعہ کی نماز کے سوا کسی مسجد میں خواتین نظر نہیں آتی تھیں۔

خوبصورت نقش و نگار والی یہ مسجد آرٹ آف دی سٹیٹ کا حسین شاہکار تھی۔اس کی دلکشی مجھے یہاں سے اٹھنے ہی نہ دیتی تھی مگر۔۔۔۔

اب جانا ضروری ہو گیا تھا کہ۔۔۔۔یونیورسٹی ٹیکنالوجی پیٹروناس کے زیرِ اہتمام آئندہ ہفتے میں ہونے والے مُقابلہٗ حُسنِ قرات و نعت کی تیاری کے لیے طلبہ و طالبات اپنے اساتذہ۔۔۔۔استاد رحمت ابو سیمان اور استاد زریت عمر کے ساتھ یہاں آ پہنچے تھے۔اساتذہ اور طلبہ کو یہاں ریہرسل کرنا تھی سو۔۔۔۔

ہم چانسلر ہال کی طرف چلے آئے۔جہاں انٹرنیشنل کلچرل نائٹ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔بقعہٗ نور بنے چانسلر ہال کے ارد گرد اکیڈمک ایریا تھا جبکہ چانسلر ہال کے باہر دو رویہ سٹالز لگائے گئے تھے۔ایک رَو۔۔۔۔یونیورسٹی کے مختلف ڈیپارٹمنٹس کے سٹالز کی تھی اور دوسری رَو میں۔۔۔۔مختلف ممالک کے طالب علم سٹالز لگائے اپنے اپنے ملک کی نمائندگی کر رہے تھے۔ پاکستانی سٹال پہ چاند تارے کا پرچم ہلکورے لے رہا تھا اور۔۔۔۔دل دل پاکستان کی دھن جذبہ حب الوطنی کو بڑھاوا دے رہی تھی۔ہمارے اطراف ملائیشیا اور غیر ملکی زبانوں کا جلترنگ تھا۔۔۔۔دیسی بدیسی کھانے تھے مگر۔۔۔۔ہمارا کھانا تو درشن کور کے گھر تھا۔اس لئے ہم نے صرف کولڈ ڈرنک پہ اکتفا کیا اور وہ بھی ہنڈرڈ پلس (100 PLUS) پہ۔۔۔۔کہ

یہ کولڈ ڈرنک بچوں کی پسند تھی۔مجھے بھی اچھی لگی۔یہ ہنڈرڈ پلس (100 PLUS) تو

مجھے انڈیا کی یاد دلا گئی تھی۔ انڈیا کے ہر وزٹ پہ۔۔۔ ہمارے سب ساتھیوں کی اولین ترجیح لمکا (LIMKA) ہوا کرتی تھی۔ ملتا جلتا ذائقہ تھا ان دونوں کولڈ ڈرنکس کا۔۔۔ کھٹا میٹھا سکنجبین جیسا۔

دس پندرہ منٹ کی اُترائی چڑھائی کے بعد۔۔۔ ٹرونو مائنز کے آخری سرے پر پرانی طرز کے بنے گھروں میں سے۔۔۔ آخری کونے والے بڑے سے گھر کے سامنے گاڑی رک گئی۔ اس کے ایک طرف بھینسوں کا باڑا تھا اور دوسری طرف رہائشی کمرے بنے تھے۔ درمیان میں ایک راہداری تھی جو گھر اور باڑے کو ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے تھی۔ ہلکے پیلے بلب کی روشنی میں درشن کور اور جرنیل سنگھ ہمارے منتظر تھے۔

میں نے دیکھا!۔۔۔ کہ باہر چاندنی پھیلی تھی۔ جھینگروں کا شور تھا اور۔۔۔ جگنوؤں کی آنکھ مچولی تھی جبکہ۔۔۔ اندر پنجاب کی ثقافت تھی۔۔۔ دیوار پہ ٹانگی گئی چنگیریں تھیں ۔۔۔ کارنس پہ سجے پیتل تانبے کے برتن تھے اور ایک طرف قطار در قطار جست کے صندوق تھے۔ مجھے لگا!۔۔۔ جیسے میں اپنے گاؤں SP-37 کے کسی گھر میں آ گئی ہوں۔۔۔۔ وہی رہتل، وہی ثقافت، مجھے بہت اچھا لگا یہ انداز اور یہ جوڑی۔۔۔ بوٹا سے قد کی درشن کور اور اونچا لانبا جرنیل سنگھ۔۔۔ جنہوں نے ملائیشیا میں بھی اپنا جالندھر بسا رکھا تھا۔ جرنیل سنگھ جم پل تو یہیں کا تھا کہ۔۔۔

جرنیل سنگھ کے دادا کو انگریز۔۔۔ پولیس میں بھرتی کر کے یہاں لے آئے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب۔۔۔ برطانیہ اور ہالینڈ نے ایک معاہدہ کیا تھا اور جنوب مشرقی ایشیا کے علاقے بانٹ لئے تھے۔ انگریزوں کے حصے میں دیگر علاقوں کے ساتھ ملائیشیا بھی آ گیا تھا۔ جہاں ربڑ، ٹن، کوئلہ اور دیگر معدنیات کے وسیع ذخائر تھے۔ انگریزوں نے سونا اُگلتی اس زمین پر اپنے قدم جمائے۔۔۔ اور انہیں مضبوط کرنے کے لئے اپنی علاقائی حدود کو بڑھا وا دینا

شروع کر دیا۔ شروع میں تو ان کی دلچسپی صرف تجارت تک تھی مگر ارد گرد کی سر اٹھاتی ریاستوں اور بغاوتوں نے انگریزوں کو چوکنا کر دیا۔ ان حالات سے نمٹنے کے لئے انہوں نے ایک حکمت عملی تیار کی اور اپنے زیرِ اثر ریاستوں میں اپنا تسلط قائم کر لیا۔ ان دنوں برصغیر پاک و ہند میں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی چھائی ہوئی تھی۔ وہاں ہر طرف انگریزوں کا توتی بولتا تھا۔ اپنے اسی اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے انگریز۔۔۔ بڑی تعداد میں ہندوستان کے سکھوں کو یہاں لے آئے اور۔۔۔ پولیس میں ملازم کرا دیا۔ جرنیل سنگھ کے دادا بھی اسی کھیپ میں یہاں آئے تھے اور پھر بس یہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ یہاں رچ بس تو گئے تھے مگر ۔۔۔۔

انہوں نے اپنے جالندھر سے ناتا نہیں توڑا تھا۔ رشتوں کی جڑت بھی نہیں ٹوٹنے دی تھی تبھی تو۔۔۔ جرنیل سنگھ کے والد اور پھر جرنیل سنگھ۔۔۔ دونوں کے بیاہ جالندھر میں کئے تھے۔ درشن کور تیرہ برس کی عمر میں یہاں آئی تھی۔

بھوراجنی سی جی درشن جدوں ساڈا ویاہ ہویا جی۔۔۔ جرنیل سنگھ نے فخریہ بتایا۔

وہ اپنی کہانی سنا رہا تھا اور درشن کور ہمارے لئے مٹر کے چاول، لہسوڑے کا اچار، گندلوں کا ساگ، مکھن اور مکئی کی گرم روٹیاں لے آئی تھی۔ گندلوں کے ساگ کے ساتھ مکھن کا پیڑا دیکھ کے میرے کانوں میں۔۔۔ میڈم نور جہاں کی آواز گونجنے لگی تھی۔

گندلاں دا ساگ تے مکھن مکئی

رن کے لیائی آں میں سجنا دے لئی

ہم کھانا کھا رہے تھے اور جرنیل سنگھ جو۔۔۔ ہمارے ساتھ بیٹھا تھا مگر بے چینی سے بار بار پہلو بدل رہا تھا۔۔۔ وقفے وقفے سے درشن کو آواز لگا رہا تھا۔

او کتھے رہ گئی ایں درشن۔۔۔ آ وی جاہُن

اور میں نے دیکھا۔۔۔ جیسے ہی درشن کور دودھ پتی اور اپنے ہاتھ کے بنائے موتی

چور کے لڈو ہمارے لئے لے کر آئی۔ جرنیل سنگھ تیزی سے باہر کی طرف لپکا اور درشن۔۔۔ آنکھوں میں پیار بھرے اسے تکتی رہی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتی۔ وہ خود ہی بول اُٹھی۔

ایہد انشہ ٹٹ ریا اے جی ایس ویلے۔۔۔ پُوا چڑھان ٹُر گیا اے ہُن

درشن کے لہجے میں گلہ نہیں۔۔۔ پیار تھا اور یہ پیار ان دونوں کی پچاس برسوں کی رفاقت اور۔۔۔ بہترین سنگت کا غماز تھا اور۔۔۔ جانے کب میں جرنیل سنگھ خموشی سے آ کے پھر محفل کا حصہ بن گیا تھا اور درشن کور اپنی داستان سنا رہی تھی۔

دونوں کی اچھی نبھ رہی تھی۔ دو بچے تھے۔۔۔ اور دونوں ہی کامیاب زندگی گزار رہے تھے۔ یہ دونوں میاں بیوی یہاں اپنی راجدھانی بسائے ہوئے تھے۔ دونوں مل کے دودھ ،گھی کا کاروبار کر رہے تھے۔ ٹرونو مائنز اور اس کے گردونواح کے بہت سے گھروں میں دودھ یہی پہنچاتے تھے۔ میرے بچوں سے بھی ان کا تعلق اسی حوالے سے ہوا تھا اور پھر۔۔۔ گوڑھی محبت میں بدل گیا تھا۔ اب یہ محبت اتنی گوڑھی ہو گئی تھی کہ ان لوگوں نے ہمارے لئے دستر خوان سجا دیا تھا۔

پردیس میں میری بیٹی کو مخلص لوگوں کی محبتیں میسر تھیں۔

میں بھی درشن کور اور جرنیل سنگھ سے مل کے بہت خوش تھی۔ اس محبت میں مجھے اپنا پنجاب دکھائی دیا تھا۔

میں انہیں دیکھتی جاتی تھی اور۔۔۔ جی ہی جی میں ان کو سراہتی تھی۔۔۔ جنہوں نے اپنے جیون کی کئی دہائیاں اس دیس میں گزار دی تھیں مگر۔۔۔ اس ترقی یافتہ ملک میں رہ کر بھی انہوں نے پنجاب کو۔۔۔ پنجاب کے ریت رواج کو اپنے دل میں۔۔۔ اپنے گھر میں بسا رکھا تھا۔

لٹل انڈیا کی پونم کور

اپیوہ (IPOH) ایک تاریخی شہر جو۔۔۔

ملائیشیا کی سٹیٹ پیراک کا دارالخلافہ ہے۔ جس کے جنوب میں کوالالمپور ہے اور شمال میں جارج ٹاؤن پینانگ ہے۔ کنتا (KINTA) ڈسٹرکٹ میں یہ ملائیشیا کا چوتھا بڑا شہر ہے جو ۔۔۔کبھی ملایا کا ایک گاؤں ہوا کرتا تھا۔ دریائے کنتا (KINTA RIVER) کے ساتھ آباد اس گاؤں میں تب۔۔۔۔ لگ بھگ تین چار سو گھر ہوا کرتے تھے لیکن 1880ء میں جب ۔۔۔یہاں ٹن کے ذخائر دریافت ہوئے تو۔۔۔۔ اس پس ماندہ گاؤں کے دن ہی بدل گئے۔ مقامی اور غیر مقامی باشندوں نے خصوصاً چینی کان کنوں نے بہت محنت کی اور اس شہر کو ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا مگر۔۔۔۔

1892ء میں یہ شہر ویران ہو گیا۔ اچانک یہاں ایسی آگ بھڑکی۔۔۔۔ جس نے پورے اپیوہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ آگ کئی روز تک جلتی رہی۔۔۔۔ تباہی پھیلاتی رہی اور پھر۔۔۔۔ رفتہ رفتہ ٹھنڈی پڑ گئی لیکن۔۔۔۔ اس شہرِ پُرملال کے لوگوں کے جذبے ٹھنڈے نہ پڑے۔ انہوں نے اس تباہی و بربادی پہ رونے دھونے کی بجائے خود کو سنبھالا اور پھر۔۔۔۔ باقاعدہ منصوبہ بندی کے بعد اس سوختہ شہر کو نئے سرے سے تعمیر کیا۔ چینی جو یہاں کان کنوں کی حیثیت سے آئے تھے۔ انہوں نے اس شہر کو بنانے سنوارنے میں بھرپور ساتھ دیا۔ انہوں نے

ٹن کی اس وادی میں سرمایہ کاری بھی کی اور شہر کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ یوں یہ اُجڑا اُپجڑا شہر، شہرِ امارت (CITY OF MILLIONAIRES) کہلانے لگا۔ ہم جب یہاں آئے تو یہ تاریخی شہر۔۔۔ ابھی پوری طرح جاگا نہیں تھا۔ سڑکوں پہ رونق بھی نہیں اتری تھی کہ ہم تو ۔۔۔ پَو پھٹتے ہی اس شہر کے سفر پہ نکل کھڑے ہوئے تھے جس کے رستے میں۔۔۔ دونوں طرف ربڑ اور پام کے درخت آنکھوں کو تراوٹ بخشتے تھے اور جہاں۔۔۔ سارے رستے برستی بارش کھنکھناتے سِکّوں سا جلترنگ بجاتی تھی اور فضا کو مترنم سا کر جاتی تھی۔ جہاں۔۔۔ گام گام چینی، جاپانی اور برطانوی رنگ اپنی جھلک دکھاتے تھے اور مبہوت سا کر جاتے تھے۔

سورج نکلنے سے پہلے ہی افضال نے اپنی پروٹون طیارہ اپوہ ریلوے اسٹیشن کے سامنے روک دی تھی۔ پہلی نظر میں ریلوے اسٹیشن کی یہ سفید دودھیا عمارت مجھے تاج محل کی طرح لگی تھی۔ یہ منی تاج محل نما عمارت نیو کلاسیکل طرز پہ بنائی گئی تھی جو۔۔۔ بڑی طلسماتی خاموشی اوڑھے ہوئے تھی۔ اس عمارت کی یہ خاموشی مجھے حیرت میں ڈال گئی تھی کہ۔۔۔ یہاں نہ تو بھاگتے دوڑتے مسافروں کا جمِ غفیر دکھائی دیتا تھا اور نہ خوانچہ فروشوں کی پاٹ دار آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اس وقت ٹرین پلیٹ فارم پہ موجود تھی مگر۔۔۔ وہ بھی بنا سیٹی بجائے۔۔۔ بنا اودھم مچائے اپنی چھب دِکھلا رہی تھی۔

میں نے کب دیکھے تھے ایسے پُراسرار خاموشی میں لپٹے ریلوے اسٹیشن؟۔۔۔۔

ہمارے ہاں تو جب تک شور نہ ہو۔۔۔ بھگدڑ نہ ہو۔۔۔ کھوّے سے کھوّا نہ چھلے۔۔۔ زندگی کا لطف ہی نہیں آتا۔ ہمارے ریلوے اسٹیشن پہ تو مسافروں کی دھکم پیل ہوتی ہے۔۔۔ قلیوں کی بھاگ دوڑ ہوتی ہے۔۔۔ گرم چائے۔۔۔ گرم آنڈے کی تیز آوازیں سنائی دیتی ہیں جب کہ۔۔۔ اپوہ کے ریلوے سٹیشن پہ اک طلسماتی خموشی تھی۔۔۔ صاف ستھری انتظار گاہیں تھیں۔۔۔ سجے سجائے سٹال تھے اور تحمل مزاج مسافر تھے۔ ریل وقت

مقررہ پہ آئی۔۔۔خود کار دروازے کھلے اور مسافروں کا ردو بدل ہوتے ہی بند ہو گئے اور ریل دیکھتے ہی دیکھتے یہ جا۔۔۔وہ جا۔۔۔نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

وقت کی پابندی زندہ قوموں کا شیوہ ہے اور وقت کی اس پابندی نے ہی ہمارے دس برس بعد آزادی حاصل کرنے والے اس ملک کو سلام ستو ملائیشیا یعنی نمبرون بنا دیا ہے۔

تبھی تو اس ریلوے اسٹیشن کی اندرونی اور بیرونی فضا میں اک قرینہ تھا۔۔۔اک سلیقہ تھا۔سٹیشن کے باہر ان گنت گاڑیاں بڑے قرینے سے پارک کی گئی تھیں کہ۔۔۔اس ترقی یافتہ ملک میں لوگ ذاتی گاڑیوں کی بہتات اور پٹرول کی ارزانی کے باوجود ٹرین سے سفر کرتے ہیں۔ذاتی گاڑی ان کے لیے سٹیٹس سمبل نہیں ضرورت ہے۔اسکوائر میں ریلوے اسٹیشن کی عمارت کے بالکل سامنے وار میموریل (WAR MEMORIEL) ہے جسے۔۔۔سٹیٹ پیراک کے ان شہیدوں کی یاد میں تعمیر کیا گیا ہے جو جنگِ عظیم اوّل اور جنگِ عظیم دوم کی نذر ہوئے۔اس وار میموریل پہ کندہ یہ عبارت ان شہید ہونے والوں کو خراجِ تحسین پیش کر رہی تھی۔

"SACRED TO MEMORY OF THE MEN FROM THE STATE PERAK WHO FELL IN THE GREAT WAR 1914-1918AND TO THOSE WHO DIED IN THE 1938-1945WAR"

کتنی جانیں ان جنگوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔میں نے سوچا!

اقتدار کی ہوس اور انتقام کی آگ کتنی زندگیوں کے چراغ گُل کر دیتی ہے۔۔۔۔

ہریالی اور خوشحالی کو بدحالی میں بدل دیتی ہے۔بہت کبیدہ خاطر میں اس وار میموریل سے نکلی۔

بالکل اُسی طرح جیسے۔۔۔انڈیا میں امرتسر کے تاریخی جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر کی سفاکی کا نشانہ بننے والوں اور گھبرا کے قریبی کنوئیں میں چھلانگ لگا کر۔۔۔اپنی جانیں بچانے کی

کوشش میں موت کو گلے لگا لینے والوں کی یادگار MARTYER'S WELL اور MARTYER'S GELLERY کو دیکھ کے دُکھی ہو گئی تھی اور پھر کتنے ہی دن ۔۔۔۔بوجھل دل لئے پھرتی رہی تھی۔

جنگ ایک جنونی کھیل ہے جس میں ۔۔۔۔جان کی بازیاں لگتی ہیں اور در و دیوار پہ ہر سُو۔۔۔۔ایسی تباہیاں اور ہولنا کیاں لکھی جاتی ہیں جن کے اثرات صدیوں تک پھیل جاتے ہیں۔

ہیروشیما اور ناگاساکی کی بربادی کون بھول سکتا ہے؟

جہاں تابکاری اثرات نے اب تک پنجے گاڑھ رکھے ہیں۔تبھی تو دنیا کے ہر خطے میں موجود امن پسند لوگ جنگ کے خلاف آواز اٹھاتے رہتے ہیں۔دنیا بھر کے شاعر، ادیب جنگ کے مخالفت میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔برصغیر پاک و ہند کے مقبول شاعر ساحر لدھیانوی نے بھی جنگ کی تباہ کاریوں پہ یہ نظم لکھی تھی۔

خون اپنا ہو یا پرایا ہو
نسل آدم کا خون ہے آخر

جنگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں
امن عالم کا خون ہے آخر

بم گھروں میں گریں کہ سرحد پر
روح تعمیر زخم کھاتی ہے

کھیت اپنے جلیں کہ اوروں کے
زیست فاقوں سے تلملاتی ہے

ٹینک آگے بڑھیں کہ پیچھے ہٹیں
کوکھ دھرتی کی بانجھ ہوتی ہے

فتح کا جشن ہو کہ ہار کا سوگ
زندگی میتوں پہ روتی ہے

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی

آگ اور خون آج بخشے گی
بھوک اور احتیاج کل دے گی

اس لئے اے شریف انسانو
جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے

آپ اور ہم سبھی کے آنگن میں
شمع جلتی رہے تو بہتر ہے

اسٹیشن اسکوائر سے نکلے تو دائیں طرف لبِ سڑک ایستادہ ہائی کورٹ کی شاندار عمارت نے بھی لمحہ بھر کو ہمیں روک لیا۔ کبھی یہ عمارت برطانوی ریذیڈنٹ آر۔ ڈبلیو۔ تھامسن (R.W.THOMPSON) کے تصرّف میں رہی تھی ۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ۔۔۔انگریز اس دیس میں اپنے قدم جما رہے تھے اور برصغیر کی طرح یہاں بھی اپنا تسلط قائم کرنے کی کوششوں میں لگے تھے۔ ملایا کی کچھ ریاستوں کی باہمی چپقلش کو اپنی تجارت کے لیے جب انگریزوں نے خطرہ محسوس کیا تو۔۔۔اپنی علاقائی حدود کو مزید پھیلانے کی تدابیر کرنے لگے۔ 1874ء میں انہوں نے پیراک میں اپنا پہلا گورنر مقرر کر دیا اور پانچ ریاستوں نیگیری، سیمیلان، سیلنگور، پاہانگ اور پیراک میں جب اپنے ریذیڈنٹ مقرر کئے تو۔۔۔پیراک کے برطانوی ریذیڈنٹ آر۔ ڈبلیو۔ تھامسن (R.W.THOMPSON) کے لئے یہ عمارت رہائش گاہ کے طور پر منتخب کی گئی تھی۔ شاہانہ ٹھاٹ باٹ کا دور دیکھنے والی یہ عمارت اب منصفوں اور مجرموں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔

شورشوں میں گھرے اس شہر پہ کبھی انگریزوں کا تسلط رہا اور کبھی ۔۔۔یہاں جاپانی اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہوئے مگر اس شہر کو سنوارنے۔۔۔نکھارنے اور ترقی کی راہ پر چلانے میں مثبت کردار۔۔۔چینیوں نے ادا کیا یہی وجہ ہے کہ اس شہر کی عمارتوں میں کہیں ۔۔۔برطانوی طرزِ تعمیر جھلکتا ہے اور کہیں چینی جاپانی رنگ ۔۔۔دکھائی دیتا ہے لیکن اس وقت میرے سامنے ایک مغلیہ طرز کی عمارت تھی۔ ٹاؤن پاڈانگ مسجد (TOWN PADANG MOSQUE) چوکور شکل کی یہ خوبصورت مسجد ملّے کمیونٹی کے پُر آشوب دور

میں ۔۔۔۔ یہاں کے ایک دولتمند وطن پرست مسلم تامل شیخ آدم نے ۔۔۔۔ تعمیر کرائی تھی اور ایپوہ کی تاریخ میں اپنا نام سنہری حروف میں رقم کرالیا تھا۔ 1908ء میں تعمیر کی گئی یہ مسجد پوری ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی اپنی آب وتاب برقرار رکھے ہوئے تھی۔ ظہر کی نماز ہم نے اسی ٹاؤن پادانگ مسجد میں ہی ادا کی تھی۔

آدھا دن گزر گیا تھا ۔۔۔۔ شہر بھی آدھے سے زیادہ گھوم لیا تھا۔ اب بھوک اور دھوپ دونوں چمک رہی تھیں۔ افضال کی پروٹون طیارہ اب کمرشل بلڈنگز کی طرف گامزن تھی۔ کمرشل بلڈنگز کا یہ بلاک 1930ء میں بنایا گیا تھا اور یہیں وہ بیل فیلڈ سٹریٹ (BELFIELD STREET) تھی جہاں ۔۔۔۔ ٹاؤن پادانگ مسجد کے بانی شیخ آدم کے فرزند ارجمند جان صاحب نے اپنا شاندار دفتر بنایا تھا اور ۔۔۔۔ اپنے والد کا کنتا بکیری کا کاروبار سنبھال لیا تھا۔ افضال سے اس کی اتنی تعریف سنی تھی کہ میرا جی چاہا۔ پل بھر کو یہاں رکوں اور عمدہ ذوق وشوق والے اس امیرزادے کا عالی شان دفتر دیکھوں مگر ہم ۔۔۔۔ اسے پھر کبھی دیکھنے کا ارادہ کر کے اس طرف چل دیے جہاں قریب ہی ۔۔۔۔ ایک رستہ لٹل انڈیا کو جاتا تھا۔

ایک کشادہ سڑک پہ دائیں طرف بڑے سے داخلی دروازے پہ جلی حروف میں لکھا ہوا ۔۔۔۔ لٹل اِنڈیا (LITTLE INDIA) ہمیں اپنی طرف بلاتا تھا جہاں ۔۔۔۔ ہمارے اچھرہ بازار کی طرح تاحدِ نگاہ سر ہی سر دکھائی دیتے تھے ہم اس ہجوم کا حصہ بنے تو دیکھا کہ بہت سے پاکستانی ۔۔۔۔ انڈین اور بنگلہ دیشی یہاں خریداری میں مصروف تھے۔ افضال نے بتایا کہ اس ملک میں بسنے والے ہم پردیسوں کو جب اپنے دیس کے ذائقے اور اشیاء کی طلب ہوتی ہے تو پھر وہ ۔۔۔۔ لٹل انڈیا کا رخ کرتے ہیں۔ ہم بھی چکی کا پسا خالص آٹا، بیسن اور مصالحہ جات کی خریداری یہیں سے کرتے ہیں۔

یہاں آ کے مجھے یوں لگا جیسے میں انڈیا میں ہوں ۔۔۔۔

دہلی کی شنکر مارکیٹ یا جنپت نگر میں گھوم رہی ہوں۔ یہاں اس بازار میں دونوں طرف انڈین مصنوعات سجی تھیں اور ان دکانوں پہ انڈین ناریاں کام کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ پاپڑی چاٹ، بھیل پوری، مصالحہ دوسا اور اجوائن، زیرہ، پودینہ اور املی پانی کے ذائقوں والے پانی پوری کے سٹال مجھے اپنی اور بلاتے تھے اور۔۔۔ دکانوں میں سجی رنگین ساڑھیاں میری توجہ اپنی طرف کھینچتی تھیں مگر بچے۔۔۔ سری آنند بھون کی جانب بڑھے جاتے تھے جہاں۔۔۔ گرما گرم پوریاں اور کچوریاں تھیں۔۔۔ کھٹی میٹھی آلو بھاجی تھی اور لسی کے بڑے بڑے گلاس تھے۔۔۔ جو مجھے دلی کی بنگالی مارکیٹ کے نتھوز (NATHU's) کی یاد دلا گئے تھے۔

دلی کا یہ ریسٹورنٹ مجھے بہت پسند تھا۔ میں جب بھی انڈیا گئی نتھوز ریسٹورنٹ میں ضرور گئی۔

شہر کے بارونق علاقے کے اس ریسٹورنٹ میں ہمہ وقت ہاؤس فل رہتا تھا۔ مختلف تہذیب اور ثقافت کے لوگ یہاں دکھائی دیتے تھے اور میں دیر تک یہ بکھرے رنگ سمیٹتی رہتی تھی۔ مجھے یہ سری آنند بھون بھی اچھا لگا تھا۔ ناشتے کے بعد بچے گراسری لینے چلے گئے تھے اور میں۔۔۔ کچھ دیر کو یہیں ٹک گئی تھی۔ تعبیر کو گود میں دُبکائے اس ریسٹورنٹ کی کھڑکی سے لٹل انڈیا کی رونقیں دیکھ رہی تھی۔

مجھے گہما گہمی بہت اچھی لگتی ہے۔ منہ بسُورے لوگ اور خاموشی اوڑھے گھر اور بازار مجھے اچھے نہیں لگتے۔ لٹل انڈیا میں چوڑیوں کی کھنک اور رنگین آنچلوں کی دھنک بکھری ہوئی تھی۔ یہاں رنگین پگڑیاں تھیں۔۔۔ چمکتی بندیاں تھیں۔ یہ چمک دمک۔۔۔ یہ رنگ ڈھنگ لٹل انڈیا آنے والوں کو خوش آمدید کہتے تھے اور یہاں کے لوگ۔۔۔ اپنی میٹھی بولی میں اپنی دکان کی طرف بلاتے تھے۔ میں اس رونقوں والے بازار میں دونوں طرف سجی دکانیں دیکھتی تھی اور۔۔۔ آگے بڑھتی جاتی تھی۔ ہمارے انارکلی بازار کی طرح یہاں بھی لوگ آوازیں لگاتے اور

۔۔۔۔گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔میرے دائیں طرف پریانکا ساڑھی ہاؤس کا بورڈ لگا تھا۔جس کے سامنے کھڑے ایک بھاری بھر کم سردار جی ہمیں اپنی دکان پہ آنے کا اشارہ کر رہے تھے جبکہ بائیں طرف پونم ساڑھی ہاؤس پہ اک نمکین صورت سکھنی ہمیں اپنی طرف بلاتی تھی اور میں اس نمکین حسن کی کشش میں بے اختیار اس دکان کی سیڑھیاں چڑھتی جاتی تھی۔

مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کے اس کی مترنم آواز کی جھنکار سنائی دی۔

جی آیاں نوں! آپ جی اندر آجاؤ! اس کا بھیگا بھیگا لہجہ مجھے پونم ساڑھی ہاؤس کے اندر لے گیا جہاں۔۔۔۔چاندنی بچھی ہوئی تھی۔۔۔۔گاؤ تکیے لگے تھے بالکل اسی طرح۔۔۔۔جیسے یہ لوگ اپنے دیس بھارت میں کاروبار کرتے تھے۔وہی ریت رواج یہاں بھی رکھے ہوئے تھے۔تجوری کے پاس زعفرانی رنگ کی پگڑی سجائے اک ادھیڑ عمر سردار جی گہری نظروں سے ہمیں جانچ رہے تھے۔

دو سیلز گرلز ریک میں ساڑھیاں رکھ رہی تھیں اور وہ سلونی سی لڑکی ہماری پذیرائی کو بچھی جارہی تھی۔آپ جی کتھوں آئے ہو جی؟ اس نے شبنمی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے پوچھا۔

میں پاکستانی آں جی! پاکستان توں آئی آں! میں نے جواب دیا اور۔۔۔۔میرا جواب سنتے ہی تجوری کے پاس بیٹھے سردار جی کی آنکھوں میں خاص چمک سی آگئی۔جھٹ پوچھ بیٹھے۔

پاکستان دے کس شہر توں آئے او جی؟

لاہور پاکستان توں جی۔جواب افضال نے دیا۔

لاہور کا نام سنتے ہی وہ سردار جی اپنی جگہ سے اُٹھے اور ہمارے قریب بیٹھتے ہوئے بولے۔

جی میں ستیندر سنگھ آں۔امرتسر توں پر میری جم پل لہور دی اے جی۔اپنی جنم بھومی کا

ذکر کرتے ہوئے ستیندر رسنگھ کا چہرہ تمتمانے لگا تھا اور آنکھوں میں نمی کی ہلکی سی لکیر بھی اُبھر آئی تھی۔ میں نے سوچا! اپنے آبائی شہر اسی طرح لو دیا کرتے ہیں۔ چہروں کو جگمگاتے ہیں اور پلکوں پہ تارے سجاتے ہیں۔ میں نے دہلی کے ذکر پہ اپنے ابا جان کو ہمیشہ یونہی جگمگاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اپنے بڑوں کی ہجرت اور اس ہجرت کے دکھ کا اندازہ تھا مجھے اسی لیے میں ---انہماک سے ستیندر رسنگھ کی کتھا سُنتی رہی۔

کہانی وہی تھی ---دُکھ بھی وہی تھے جو گزشتہ چھ دہائیوں سے دونوں طرف کے ہجرت کرنے والے سناتے آرہے تھے۔ میں نے ان دکھوں کو اپنے ماں باپ کی آنکھوں سے چھلکتے بھی دیکھا تھا۔ یادیں مجھے دُکھی کر گئیں تو میں نے بات کا رُخ موڑا اور ان سے ساڑھیاں دکھانے کی فرمائش کر دی۔ دونوں سیلز گرلز متحرک ہو گئیں اور بہت سی ساڑھیاں میرے سامنے پھیلا دیں میں نے ایک ساڑھی پسند کی اور اٹھنا چاہا مگر---

سردار جی کے اشارے پہ پونم چائے لے آئی تھی اور---ساتھ ہی ہلدی رام کی نمکو بھی۔ وہ سلونی سی لڑکی پونم تھی سردار جی کی بیٹی۔ چائے کے دوران ستیندر رسنگھ نے یہ انکشاف کیا کہ---بیس برس پہلے جب وہ محنت مزدوری کے لیے یہاں آئے تب---پونم چار برس کی تھی۔ پہلے پہل تو کئی برس وہ مزدوری کرتے رہے اور ساتھ ساتھ کچھ رقم بھی پس انداز کرتے رہے۔ تھوڑی سی اس رقم سے انہوں نے کاروبار شروع کیا تھا اور اب اپنی محنت، لگن اور اپنوں کے تعاون سے کاروبار چمکا لیا تھا۔ یہ دونوں سیلز گرلز بھی وہ امرتسر سے لائے تھے۔ پونم بھی کاروبار میں ان کا ساتھ دیتی تھی۔ اب وہ معہ فیملی یہاں رہائش پذیر تھے مگر سال میں دوبار اپنے دیس ---اپنے شہر ضرور جاتے تھے۔ مال لانے کے لئے---اپنوں سے ملنے اور گولڈن ٹیمپل میں ماتھا ٹیکنے کے لیے---اپنے دیس---اپنی مٹی کی محبت سے جڑے ستیندر رسنگھ رشتوں کی جڑت بھی سنبھالے ہوئے تھے۔

کتنی ہی دیر پونم ساڑھی ہاؤس میں قہقہے گونجتے رہے۔ دو الگ الگ ملکوں کے شہری ۔۔۔ایک تیسرے ملک میں مل بیٹھے تھے۔ مجھے اچھا لگا تھا ان کا سبھاؤ۔۔۔ان کا رکھ رکھاؤ تبھی تو میں نے بلاارادہ ساڑھی خرید لی تھی اور ارم نے راجھستانی کرتا کیونکہ ساڑھی اسے پسند ہی نہیں رہی کبھی۔

مجھے لٹل انڈیا اچھا لگا تھا۔ مجھے اچھا لگا تھا کہ ستیندر سنگھ اور ان جیسے بہت سے اور ۔۔۔اس اجنبی ملک میں اپنی شناخت بنائے ہوئے تھے۔ پردیس میں بھی اپنا دیس بسائے ہوئے تھے۔

میرا جی چاہا! کاش۔۔۔۔یہاں لٹل پاکستان بھی ہو جو اس دیس میں ہماری بھی پہچان بنائے ہوتا کہ۔۔۔جب بھی کوئی پاکستانی اس دیس میں۔۔۔اس شہر مین آئے تو وہ فخر سے سر بلند کئے اپنے لٹل پاکستان میں آئے اور اپنے دیس کی۔۔۔اپنی پسند کی چیزیں خریدے۔

اس شہر میں یوں تو ابھی دیکھنے کو بہت کچھ تھا مگر۔۔۔ایک تو شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے اور دوسرے یہاں لٹل پاکستان نظر نہ آنے پر دل میں جو ہُوک اُٹھی تھی۔ اس نے مجھے مُضطرب کر دیا تھا۔ مجھے یوں افسردہ دیکھ کر ارم اور افضال نے کچھ گٹ پٹ کی اور کچھ ہی دیر میں ہم پاکیزہ ریسٹورنٹ آپہنچے تھے۔ یہ ایک پاکستانی ریسٹورنٹ تھا جہاں۔۔۔آ کے میری پاکستانیت کو قرار آ گیا تھا۔ میں کتنی ہی دیر اس عمارت کے ماتھے پہ جگمگاتے پاکستان کو تکتی رہی۔ سرشار ہوتی رہی کہ مجھے۔۔۔لٹل پاکستان نہ سہی پاکستانی ریسٹورنٹ تو دکھائی دیا تھا جو ۔۔۔یہاں بسنے والے پاکستانیوں کی پہچان تھا۔۔۔ان کا مان تھا۔ پاکیزہ ریسٹورنٹ میں سب کھانے۔۔۔سارا عملہ اور باورچی سب کے سب پاکستانی تھے مگر۔۔۔انہیں کھانے والے صرف پاکستانی ہی نہیں تھے۔ جس کا اندازہ مجھے ریسٹورنٹ کی آخری میز پہ رنگ برنگی پگڑیوں والوں کو سیخ کباب کے مزے لوٹتے دیکھ کر ہوا۔

میرا جی چاہا۔ میں اس ہوٹل کے بانی سے ملوں ۔۔۔۔اس کی کاوش کو سراہوں مگر ۔۔۔۔میں ان سے نہ مل سکی تھی کہ وہ تو عمرے کے لیے گئے ہوئے تھے لیکن۔۔۔۔ان کی پوتی زہرہ نے اپنے دادا کی نمائندگی کرتے ہوئے پورا پاکیزہ ریسٹورنٹ اپنی مَعیّت میں ہمیں دکھایا تھا اور۔۔۔۔ان کی جدوجہد کے دس برسوں کی داستان بڑے فخر سے ہمیں سنائی تھی۔ بزنس مینیجمنٹ میں ڈگری لینے کے بعد اب وہ اپنے دادا کے اس ریسٹورنٹ کو سنبھالے ہوئے تھی۔

ٹوئن ٹاورز

میں اس شہر میں پہلے بھی آئی تھی مگر۔۔۔۔

تب اسے دیکھے بنا اپنی منزل کی طرف چل دی تھی کہ آسمان کی بلندیوں کا تعاقب کرتی عمارتوں والے اس شہر کو یوں گھڑی بھر میں دیکھنا ممکن نہ تھا۔

کوالالمپور۔

سرسبز و شاداب پہاڑی سلسلے کے دامن میں خوبصورتی سے پھیلا ہوا ایک خوبصورت شہر۔۔۔جس میں تین ندیاں بہتی ہیں اور اس کے حسن کو بڑھاوا دیتی ہیں۔عمارتوں، مسجدوں، گاڑیوں اور لوگوں کے اژدحام والا یہ شہر۔۔۔۔ سیلنگور کی ریاست میں دریائے کالانگ اور دریائے گمباک کے سنگم پہ بڑی تمکنت سے سر اٹھائے کھڑا ہے۔ یہ شہر کبھی ٹن کے کان کنوں کی بستی ہوا کرتا تھا مگر اب۔۔۔۔ یہ آبادی کے لحاظ سے ملائیشیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔

اس شہر کی شروعات 1850ء میں ہوئی جب۔۔۔۔ کالانگ کے مالے سردار نے کچھ چینی ماہرین کو۔۔۔۔ٹن کی کانیں دریافت کرنے کو یہاں بھیجا اور انہوں نے۔۔۔۔ دریائے گمباک کے قریب کانوں کی کھدائی شروع کر دی۔ اس وقت کی یہ ٹن کے کان کنوں کی بستی ڈیڑھ صدی گزر جانے کے بعد اب۔۔۔۔ جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ جدتوں والے اس شہر کا روپ دھار گئی ہے جس کے۔۔۔۔ پیٹروناس ٹوئن ٹاورز کا چرچا دنیا بھر میں ہے جس کی

۔۔۔بلند و بالا عمارتیں جدید و مقامی طرز تعمیر کا شاہکار ہیں اور۔۔۔جس کی عالیشان مساجد اور ان مساجد کے سر بفلک مینار ہیں اور جہاں ہر طرف پلوں اور سڑکوں کے دلفریب جال ہیں کہ ایک فلائی اوور کے بعد۔۔۔جہاں دوسرا فلائی اوور آ جاتا ہے اور جہاں۔۔۔ہر آنے والا یہ سب دیکھ کے حیرت زدہ سا رہ جاتا ہے۔

میں سڑکوں اور پلوں کے جال والے اس شہر کو دیکھتی جاتی تھی جہاں۔۔۔گاڑیوں کی بھر مار تھی اور سیاحوں کی یلغار تھی۔ہم صبح کی پُرسکون و پُرسکوت فضا میں ٹرونو مائنز سے نکلے تھے اور تقریباً دس بجے کوالالمپور کے وسط میں آ پہنچے تھے۔جہاں اک خوبصورت پارک تھا اور اس پارک کے بالکل سامنے۔۔۔ٹوئن ٹاورز کے اردگرد انسانوں کا جم غفیر تھا اور چلچلاتی دھوپ تھی مگر پھر۔۔۔پل بھر میں موسم نے آنکھیں بدل لی تھیں اور اچانک برسنے والی بارش نے عجب سماں باندھ دیا تھا۔ویسے اس دیس کا موسم ہے بہت بے اعتبار اسا اور ہم۔۔۔

اسی بے اعتبارے موسم میں اٹھاسی منزلہ اس پیٹروناس ٹوئن ٹاورز کے سامنے کھڑے تھے۔۔۔جسے نظر بھر کر دیکھنے کے لیے گردن کو کم از کم ایک فٹ پشت کی طرف گرانا پڑتا ہے اور جس کے۔۔۔سکائی برج (SKY BRIDGE) تک جانے کے لئے علی الصبح ایک طویل لائن میں لگنا پڑتا ہے کہ۔۔۔پاس لئے بغیر وہاں تک رسائی ممکن نہیں اور مقررہ تعداد پوری ہو جانے کے بعد۔۔۔خواہ کتنے ہی مقامی و غیر مقامی سیاح وہاں موجود ہوں۔۔۔پاس دینے کا سلسلہ منقطع کر دیا جاتا ہے۔ہم جب ٹوئن ٹاورز پہنچے تو اک طویل قطارِ شائقین دھیرے دھیرے آگے سرکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

ایسے میں ہماری باری بھلا کب آنے والی تھی؟

میں نے تو دل چھوڑ دیا تھا مگر۔۔۔پاس ہماری دسترس میں آ گئے تھے اور ہم۔۔۔سکائی برج تک جانے والی لفٹ تک آ گئے تھے کہ۔۔۔میرے داماد کے ایک یونیورسٹی

فیلو نے ہمارے لیے پاس لینے کی مُہم سر کر لی تھی۔ وہ ایک سیمینار میں شرکت کے لیے یونیورسٹی کی طرف سے کوالالمپور آیا ہوا تھا۔ اس نے صبح سویرے لائن میں لگ کے پاس لے لئے تھے اور ---ہمارے سکائی برج تک پہنچنے کا بندوبست کر دیا تھا۔

میں حیرت زدہ سی ٹوئن ٹاورز کی اس عمارت کو دیکھ رہی تھی اور ان ذہنوں اور ان ہاتھوں کی مہارت کی داد دے رہی تھی جنہوں نے یہ شاہکار تخلیق کیا اور--- ملائیشیا کی شدید بارشوں اور طوفانی ہواؤں کے مقابل--- چار سوفٹ زیر زمین کنکریٹ کے ستونوں کا سہارا دے کر یہ اٹھاسی منزلہ عمارت کھڑی کر دی اور--- تقریباً بیالیسویں منزل پہ جا کے ان دونوں ٹاورز کو ایک پُل کے ذریعے باہم ملا دیا۔

بلند و بالا اور خوبصورت عمارتیں ہر ملک کی ثقافت اور تاریخ کا حصہ ہوتی ہیں۔ دنیا ایسی حیرت انگیز عمارتوں سے بھری پڑی ہے جو گزشتہ سے پیوستہ دور کے باسیوں کو حیران کر دیتی ہیں۔ ٹوئن ٹاورز کا شمار بھی ایسی عمارت میں ہوتا ہے۔ جسے دیکھ کے عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہ عمارت ملائیشیا کی اسٹیٹ آئل کمپنی پیٹروناس کی ملکیت ہے۔ پیٹروناس ٹوئن ٹاورز (PETRONAS TWIN TOWERS) کا افتتاح مہاتیر محمد نے کیا تھا۔

مہاتیر محمد--- جو ملائیشیا کے ایک پسماندہ علاقے میں پیدا ہوئے۔ مہاتیر کے دادا اسکندر ہندوستانی مسلمان تھے اور ان کا تعلق--- ہندوستان کی ریاست کیرالہ سے تھا۔ مُعلّمی ان کا پیشہ تھا۔ 1857ء کے لگ بھگ انگریز--- انہیں یہاں کے باسیوں کو انگریزی سکھانے کے لیے لے آئے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب--- ملایا بھی ہندوستان کی طرح برطانوی کالونی ہوا کرتا تھا۔ اسکندر یہاں آئے تو پھر---

وہ یہیں کے ہو رہے۔ 1888ء میں انہوں نے ایک ملائی خاتون سے شادی کر لی۔ مہاتیر کے والد محمد--- اسی ملائی خاتون کے بطن سے پیدا ہوئے۔ وہ یہیں پلے بڑھے اور

۔۔۔۔اپنے والد اسکندر کے نقشِ قدم پہ چلتے ہوئے درس وتدریس سے وابستہ ہو گئے۔ 1925ء میں مہاتیر نے جنم لیا۔ یہ وہ دن تھے جب ۔۔۔۔ملک کی معیشت پر چینی قابض تھے اور ملک میں ڈنکا ۔۔۔۔برطانوی راج کا بج رہا تھا۔ مہاتیر نے اسی خوف وہراس اور غربت و بے بسی کی فضا میں ہوش سنبھالا تھا۔ ان کا دل اپنی قوم کی بے بسی پہ تڑپتا تھا اور ان کا ذہن ۔۔۔۔غلامی کی زنجیریں توڑنے کو مچلتا تھا۔ وہ یہ نظام بدلنا چاہتے تھے ۔۔۔۔کچھ کرنا چاہتے تھے مگر ۔۔۔۔

ابھی وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں تھے کہ ۔۔۔۔زمانہ طالبِ علمی کا تھا اور ماحول سعادت مندی کا اس لئے ۔۔۔۔اپنی مرضی نہ ہوتے ہوئے بھی مہاتیر محمد نے باپ کی خواہش پوری کی اور کامیاب فزیشن بن گئے مگر ۔۔۔۔دل میں اب بھی قوم کو مستحکم کرنے کے سوتے پھوٹتے تھے اور ملکی حالات بدلنے کا جذبہ ۔۔۔۔ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ انہی دنوں جاپانی ملایا پہ قابض ہو کر جب ظلم و بربریت کی تاریخ رقم کرنے لگے اور برطانیہ دوبارہ اپنے سامراجی پنجے یہاں گاڑھنے کی تگ ودو کرنے لگا تو ۔۔۔۔ملائی قوم میں آزادی کی تحریک انگڑائیاں لینے لگی۔ تبھی مہاتیر محمد کے دل میں بھی سیاست کی دبی چنگاری بھڑک اُٹھی اور وہ ۔۔۔۔آزادی کی اس تحریک میں، جلسے جلوسوں اور تقریروں ہڑتالوں میں پیش پیش رہنے لگے۔ ملک وملت سے محبت کا یہ جنون ہی انہیں حکومت کے ایوانوں تک لے گیا اور پھر ۔۔۔۔

مہاتیر محمد نے پیشۂ مسیحائی کو خیر باد کہا اور ۔۔۔۔ملایا کو ملائیشیا بنانے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ ان کی حکمت عملی اور جذبے کی سچائی نے ملائیشیا کو ترقی کی راہوں پہ دوڑایا اور اسے ۔۔۔۔ایشین ٹائیگر بنا دیا۔ مہاتیر محمد نے اپنے ملک کو "ٹورازم کی انڈسٹری" بنا دیا تبھی تو ۔۔۔۔

اس وقت بھی دنیا بھر کے مختلف ملکوں کے لوگ پیٹروناس ٹوئن ٹاورز کی بلندیوں کو دیکھنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ میں بھی ان دیکھنے والوں میں شامل ہو گئی تھی بلکہ میں تو

۔۔۔۔سکائی برج تک جانے والوں میں بھی شامل ہو گئی تھی۔اس نیپالی لڑکے کی بدولت جس نے ۔۔۔۔ہمارے شوق کے لیے اپنی نیند خراب کی اور پاس لینے کے لیے لمبی قطار کا حصہ بنا اور ۔۔۔۔ہمیں اس پُل تک پہنچا دیا۔اَسّی رنگٹ کاوہ کارڈ جو۔۔۔۔سکائی برج تک جانے کے لیے ملا تھا ہمیں اب۔۔۔۔لفٹ کی طرف جانے پہ اکسا رہا تھا اور پھر۔۔۔۔

کچھ ہی لمحوں میں ہم وہاں آ پہنچے تھے جہاں ہمارے ہر منٹ کی قیمت چار رنگٹ مقرر کی گئی تھی کہ۔۔۔۔بیس منٹ پورے ہوتے ہی انتظامیہ اس بلندی پہ آنے والوں کو پھر پستیوں میں دھکیل دیتی تھی۔بلندی پہ جا کے خود کو سنبھالنے میں مجھے کچھ سیکنڈ لگے کہ۔۔۔۔

بلندی پہ جا کے خود کو سنبھالے رکھنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔

اب پورا کوالالمپور ہماری نگاہوں کی زد میں تھا۔تیز ہواؤں کے جھونکے تھے۔۔۔۔ بادلوں کے سفید اور سرمئی بکھرے ہوئے ٹکڑے تھے۔۔۔۔گنے چُنے سیاحوں کا شور تھا۔۔۔۔ دھڑکنوں کی بے ترتیبی تھی۔۔۔۔افضال کی فوٹو گرافی تھی اور ہماری آنکھیں تھیں کہ ان نظاروں کو خود میں سموئے جاتی تھیں۔اونچی نیچی آبادیوں والا۔۔۔۔دور دور تک پھیلا ہوا یہ شہر ہماری نگاہوں کا مرکز بنا تھا اور ابھی ہم نے آنکھیں ٹھنڈی بھی نہ کی تھیں کہ ہمیں۔۔۔۔نیچے کا رستہ دکھا دیا گیا تھا۔ہم نہ چاہتے ہوئے بھی دنیا کی سب سے بلند اس جڑواں عمارت سے نیچے اتر آئے تھے گو۔۔۔۔

جی نہ بھرا تھا مگر۔۔۔۔ہمارا انداز فاتحانہ تھا کہ جہاں تک بہت سے لوگ نہ پہنچ پائے ۔۔۔۔ہم وہاں تک ہو آئے تھے۔یہاں پھر وہی ہجوم ہم نفساں تھا۔۔۔۔وہی عالمِ شوقِ عکس بندی تھا۔۔۔۔ویسی ہی چہل پہل تھی بلکہ کچھ زیادہ ہی جمِ غفیر دکھائی دیتا تھا۔قریب ہی تالاب کنارے لوگوں کا جمگھٹا تھا جہاں۔۔۔۔فوارے مختلف شکلوں کا روپ دھار کے سیاحوں کا جی لبھاتے تھے اور یہیں۔۔۔۔اسی ٹوئن ٹاورز کی عمارت کے ہالے میں (KLCC) کوالالمپور کنونشن سنٹر۔۔۔۔ایکیوریم میوزیم اور سوریا شاپنگ سنٹر یہاں آنے والوں کا دل للچاتے تھے

اور انہیں فوٹو گرافی پہ اکساتے تھے لیکن ۔۔۔ہم تھے کہ ان سب سے نظریں بچا کے نکلنا چاہتے تھے مگر۔۔۔

ہمارے اکلوتے داماد کا اصرار تھا کہ۔۔۔آپ بھلے سوریا شاپنگ سنٹر سے شاپنگ نہ کریں مگر اسے دیکھیں ضرور۔ KLCC کوالالمپور کنونشن سنٹر کا وزٹ بھی کریں اور یہاں کا میوزیم ایکیوریم اور آرٹ گیلری ضرور دیکھیں ۔لہذا ہمیں ان کی بات ماننا پڑی۔ یہاں ہر معروف برانڈ موجود تھا اور تقریباً ہر ملک کا باشندہ یہاں خریداری میں مصروف تھا۔شاید یہاں اک میں ہی تھی جو۔۔۔ان مہنگی دکانوں پہ ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کے تیزی سے یوں آگے بڑھ گئی تھی کہ کہیں۔۔۔انہیں نظر بھر کے دیکھنے کی قیمت بھی نہ چکانی پڑ جائے۔

ارم میری پھرتیاں دیکھ کے مسکرا رہی تھی۔ بیٹی تھی نا۔۔۔جانتی تھی کہ ماں کو اپنا من مارنا آتا ہے۔جہاں رسائی ممکن نہ ہو، ماں اس طرف دیکھتی ہی نہیں ۔روشنیوں اور رنگوں کو آنکھوں میں بھرتے ہم ایکیوریم چلے آئے تھے جہاں بہت دلفریب مصنوعی سمندری ماحول بنایا گیا تھا اور اس نقلی سمندر میں اصلی مچھلیاں پھڑکتی مچلتی دکھائی دیتی تھیں۔ان کے مچلنے سے منتشر لہروں میں رنگ برنگی جھیلوں کی جھلک کا منظر بہت خوبصورت تھا مگر۔۔۔

اس سے بھی زیادہ خوبصورت تو یہاں کی آرٹ گیلری تھی جس میں ۔۔۔ٹوئن ٹاورز کی تعمیر کے ابتدائی مراحل سے لے کر اس کی تکمیل کے مراحل تک کے سارے مناظر کی ۔۔۔نہایت عمدہ عکس بندی آویزاں کی گئی تھی۔گمان یہی ہوتا تھا جیسے یہ ٹاورز ہمارے سامنے تعمیر کے مراحل سے گزر رہے ہیں۔اس مشہورِ زمانہ پیٹروناس ٹوئن ٹاورز کی سیر میں ہمیں تقریباً تین گھنٹے لگ گئے تھے جب کہ اس کے پارک میں گھومنے اور یہاں کے فواروں سے دل لبھانے کو تو شاید پورا دن بھی کم رہتا مگر۔۔۔ہم تو کم وقت میں اس شہر جدید کے حسین نظاروں سے مستفید ہونا چاہتے تھے۔اس لئے الوداعی نظر ان ٹاورز پر ڈالی اور چل دیے۔

میں نے اک الوداعی نظر اس مینارا ٹاور (MENARA) پر بھی ڈالی جو۔۔۔ٹوئن ٹاورز سے تھوڑے فاصلے پر اس کی بغل میں دُبک کے بھی اپنی اہمیت جتائے ہوئے تھا۔ اس مینارا ٹاور کو سکائی برج سے بھی دیکھا تھا مگر اب۔۔۔قریب سے اس کے دیدار ہو رہے تھے۔ اس کے بارے شُنید ہے کہ یہ۔۔۔دنیا کا سب سے اونچا مواصلاتی ٹاور ہے۔ گو اس کی قامت ٹوئن ٹاورز سے نسبتاً کم ہے مگر۔۔۔اس کی اہمیت کسی طور کم نہیں کہ جڑواں ٹاورز کے سکائی برج تک رسائی نہ پانے والے بہت سے لوگ۔۔۔اس مینارا ٹاور کا ٹکٹ خریدتے ہیں اور پورے شہر کا نظارہ کر لیتے ہیں۔ یہاں اس وقت بھی ان نارسا لوگوں کا اک ہجوم تھا جو۔۔۔دل میں بلندیوں پہ جا کے اس شہرِ دلفریب کو دیکھنے کے آرزومند تھے۔ ٹکٹ لینے کی رسم یہاں بھی ادا کی جا رہی تھی مگر۔۔۔یہاں وقت کی کوئی ممانعت نہیں تھی۔

جب بھی آیئے ٹکٹ پایئے والا معاملہ تھا۔

میں نے اس مینارہ ٹاور کو بھی بھرپور الوداعی نظر سے دیکھا مگر دل میں کہیں بھی اس تک جانے کی خواہش نہ اُبھری کہ میں تو۔۔۔اس سے بھی بلند قامت میناروں تک ہو آئی تھی۔

انہی میناروں کے عقب میں کہیں ایک ماما ریسٹورنٹ پہ افضال نے گاڑی روک دی۔ بھاشا ملائیشیا میں ماما مسلم کو کہتے ہیں۔ سو یہ اطمینان ہوا دل کو۔۔۔کہ کھانا حلال ہے۔ یہ ایک درمیانے درجے کا ہوٹل تھا کھانا بھی درمیانے ذائقے کا تھا مگر صد شکر کہ حلال۔۔۔جب کہ میرے اپنے دیس میں تو بہت سے بے حس لوگ۔۔۔اپنے بھائی بندوں کو بیمار اور مردار جانوروں کا گوشت بھی کھلا دیتے ہیں۔ دھوکا، ملاوٹ، جھوٹ اور منافقت نے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں خوب قدم جما رکھے ہیں۔ ٹائے پناس (چائے) آئی تو میں سوچوں کی دُکھی دلدل سے نکلی۔ پہلی بار یہ ٹائے پناس۔۔۔منہ کو لگی تھی اور خوب لگی تھی کہ۔۔۔ذائقہ بہت عمدہ تھا۔

گام گام یہاں۔۔۔حیرتیں

اب ہماری منزل پادانگ (PADANG) تھی۔کوالالمپور کی شفاف سڑکوں پہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔میں جتنا پرسکون ماحول ٹرونومائنز (TRONOH MINES) میں دیکھ آئی تھی یہاں۔۔۔فضا اس کے بالکل برعکس تھی۔سڑکیں گاڑیوں سے بھری تھیں۔۔۔سر پہ جھلسا دینے والی دھوپ تنی تھی اور۔۔۔لوگ تھے کہ اُمڈے پڑ رہے تھے۔مقامی باشندوں کی تعداد تو شاید کم ہو گی جب کہ۔۔۔سیاحت اور روزگار کے لئے دنیا بھر سے آئے لوگ اس شہر میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔

پادانگ (PADANG) کوالالمپور کے دل میں نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے۔

سیاحوں کے لیے یہ خوبصورت جگہ ہے ۔ یہیں وہ مشہور داتاران مردیکا (MERDEKA SQUARE) ہے جسے آزادی چوک بھی کہا جاتا ہے۔یہ وہ جگہ ہے جہاں 1957ء میں۔۔۔تنکو عبدالرحمٰن نے ملایا کے باشندوں کو غلامی سے نجات کی نوید سنائی تھی۔اس آزادی چوک پہ بہت بلندی پہ لہراتا ہوا ملائیشیا کا پرچم۔۔۔اپنے عظیم حکمرانوں کے گن گاتا ہے، یہ پرچم لہراتا ہے اور اس دیس کے باسیوں کا لہو گرما جاتا ہے۔

کوالالمپور کی خوبصورتی اور شادابی اپنی جگہ مسحور کن تھی مگر۔۔۔انسانی ہاتھوں کی مہارت کے شاہکار بھی حیرت زدہ سا کر جاتے تھے جیسے کہ داتاران مردیکا سے جنوب کی طرف ایکڑوں پر پھیلی ہوئی یہ قومی مسجد جسے (NEGARA MASJID) بھی کہتے

ہیں۔۔۔دیکھنے والوں کو مبہوت کر رہی تھی۔

یہ ساؤتھ ایسٹ ایشیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔اس مسجد کی دلکشی بڑھاتی۔۔۔اس کی قدم بوسی کرتی ہوئی۔۔۔ایک پختہ نہر کی لمبی سی پٹی یہاں سے گزرتی تھی اور۔۔۔اس پٹی میں مضبوطی سے قدم جمائے ،فواروں کی لمبی قطاریں۔۔۔جی کو اک خوشگوار ٹھنڈک کا احساس دلاتی تھیں۔خوبصورت باغوں اور فواروں والی اس وسیع مسجد میں۔۔۔داخل ہونے کے لیے بھی ہمیں کچھ سیڑھیاں چڑھنا پڑیں کہ اونچی نیچی آبادیوں والے اس شہر میں۔۔۔زینے طے کئے بنا بلندی تک پہنچنا ناممکن تھا۔ایک ایک قدم دھیرے سے بڑھاتے ہوئے میں نے یہ سفر طے کیا۔اب میرے سامنے ایک کھلا پختہ میدان اور۔۔۔اس پہ بدلیوں سے ڈھکا ہوا آسمان تھا۔اس میدان کے ایک طرف ان گنت ستون اور۔۔۔ان ستونوں کا سہارا لئے ہوئے اک کشادہ چھت تھی۔ستونوں کی ان قطاروں نے چھت کو یوں سنبھال رکھا تھا جیسے۔۔۔کہار اپنے کاندھوں پہ ڈولی اٹھائے ہوتے ہیں۔یہ چھت درمیان سے اٹھان اور اطراف سے ڈھلوان لئے ہوئے تھی۔اس چھت پہ سبز اور نیلے رنگ کی ٹائلیں جڑی تھیں اور۔۔۔اٹھارہ کونوں والا ایک ستارہ نما گنبد۔۔۔اس کی دلکشی میں مزید بڑھاوا دیے ہوئے تھا۔اس گنبد کے اٹھارہ کونے دراصل ملائیشیا کی تیرہ ریاستوں اور اسلام کے پانچ ارکان کی نمائندگی کرتے تھے۔سورج کی کرنیں اس ستارہ نما گنبد کو تابناک کیے ہوئے تھیں۔جونہی بادل ذرا سا سرکتے۔۔۔تیز دھوپ پڑوسن کی طرح کن سوئیاں لینے کو جھانکنے لگتی اور۔۔۔ان اٹھارہ کونوں کو کچھ اور تمتما دیتی تھی۔اس نگار امسجد کا فقط ایک ہی بلند قامت مینار تھا جس کی ساخت۔۔۔باریک نوکدار بھالے کی مانند تھی۔اس مینار میں لفٹ بھی لگی ہوئی تھی جو موذن سے زیادہ سیاحوں کے استعمال میں آتی تھی۔وقت کی کمی کے باعث اس مینار تک رسائی کا میں نے سوچا بھی نہیں کہ۔۔۔ابھی تو میوزیم بھی دیکھنا تھا۔

(MUSEUM NEGARA) نگارا میوزیم کی عمارت کی پیشانی پر جلی حروف میں لکھا۔۔۔نگارا میوزیم کوالالمپور چمکتا تھا اور بیرونی دیواروں پہ کھدے مناظر زمانہ قدیم کی عکاسی کرتے تھے۔عمارت کے اندر داخل ہونے سے پہلے یہاں آنے والے سب سیاح ۔۔۔ان تصویری نقوش میں اس دھواں دھار ترقی کرتے ملک کی تہذیب وثقافت کی جھلکیاں دیکھتے تھے اور جب عمارت میں داخل ہو جاتے تھے تو خود کو۔۔۔ازمنہ قدیم میں موجود پاتے تھے کہ یہاں۔۔۔قبل مسیح کے دور کی گاڑیاں اور چھکڑے دکھائی دیتے تھے۔قدیم قرآنی نسخے، گھریلو اور زراعت کے استعمال کی اشیاء، پرانی عمارتوں کے لکڑی کے آرائشی دروازے، محرابیں اور طاقچے، شاہی لباس و آرائشی اور آلاتِ جنگ۔۔۔سیاحوں کو حیرتوں میں غوطہ زن کر دیتے تھے۔میوزیم کے ایک حصے میں آغازِ دنیا سے زمانۂ موجود تک کے انسان کو سپردخاک کرنے کے طریقے دکھائے گئے تھے۔سالخوردہ تابوت سے لے کر ماڈرن تابوت تک یہاں موجود تھے۔

میوزیم کے ایک اور حصے میں ملائیشیا کی (EARLY HISTORY) دکھائی گئی تھی ۔جب دوسری صدی عیسوی میں اسے دریافت کیا گیا پھر۔۔۔پہلے چینی یہاں آئے اس کے بعد مشرق وسطیٰ کے لوگ اور پھر۔۔۔پرتگالی اور ڈچ آ گئے۔پندرھویں صدی میں سلطان شریف ابوبکر نے اسے سلطنت بنایا اور۔۔۔ملحقہ جزیرے اس میں شامل کر لئے۔برونائی بھی ملائیشیا کا حصہ بنا اور پھر۔۔۔اس قدرتی وسائل اور خوبصورت موسموں والے اس ملک میں غیر ملکیوں کا آنا جانا لگ گیا۔میوزیم کا ایک حصہ ملائیشیا ٹوڈے (MALAYSIA TODAY) کا ہے۔جس میں انیسویں صدی کے آخر میں ملائیشیا کی بندرگاہوں پہ تجارت پھیلی اور برطانوی تسلط چھا گیا۔تب اس وقت کے حکمران۔۔۔تنکو عبدالرحمٰن نے ملائیشیا کو دنیا بھر میں نمایاں کیا اور مہاتیر محمد نے۔۔۔اسے ترقی کی راہ پہ ڈال دیا۔

اس ملک نے بہت سے نشیب وفراز دیکھے۔۔۔مختلف مذاہب کے مختلف ادوار

دیکھے ۔۔۔۔ وہ سب کچھ ۔۔۔۔ اس عجائب گھر میں سمو دیا گیا تھا۔ یہاں بادشاہوں کے شاہی لباس اور سامان آرائش ۔۔۔۔ اپنی داستانِ عظمت سناتے تھے تو دیوی دیوتاؤں کے بت ۔۔۔۔ آنے والوں کو اپنی طاقت کا زور دکھاتے تھے۔ پرانے وقتوں کے جنگی لباس اور آلاتِ حرب کسی جنگ کا نقشہ دکھاتے تھے ۔۔۔۔ مختلف قوموں کے مختلف ادوار کا منظر نامہ بناتے تھے اور سب دیکھنے والے ان مناظر کو اپنی آنکھوں میں بھرتے جاتے تھے۔ ہمیں بھی یہاں جانے کتنا ہی وقت لگ گیا تھا۔ کوالالمپور میں پہلا پورا دن بہت بھرپور گزرا تھا۔ اب شام اتر آئی تھی اور اس وقت ہم اس کلچرل شہر کی رونقیں دیکھتے ہوئے یونیورسٹی آف ملایا کی طرف جا رہے تھے۔

دھنک رنگ شام کے اُترتے ہی کوالالمپور میں گویا روشنیوں کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ سڑک کنارے ایستادہ، قطار در قطار قمقمے جل اُٹھے تھے۔ فلک بوس عمارتیں بقعۂ نور بن گئی تھیں ۔ اس وقت ٹریفک کا ازدحام تھا جس میں ہم بھی شامل ہو گئے تھے۔ دن بھر تو ہم نے ۔۔۔۔ جون کی چلچلاتی دھوپ کی سختیاں برداشت کی تھیں اور تیز دھوپ میں ۔۔۔۔ یکدم ہو جانے والی بارش کے بعد گھٹن اور حبس کے کی تلخیاں سہی تھیں مگر ۔۔۔۔

اب فضا میں خوشگوار خنکی در آئی تھی اور اس فرحت انگیز خنکی کے سحر میں گرفتار ہمارے با ہمت داماد نے اپنی پروٹون طیارہ کا رخ ملایا یونیورسٹی کی بجائے یہ کہہ کر سلطان عبدالصمد بلڈنگ کی طرف موڑ دیا تھا کہ:۔

"اس خوبصورت بلڈنگ کو دیکھے بنا امی جان کی کوالالمپور کی سیر ادھوری رہے گی۔"

اونچی نیچی آبادی والے اس دلفریب شہر میں ۔۔۔۔ پہاڑی پر ہونے کی وجہ سے سلطان عبدالصمد بلڈنگ کے خدوخال دور سے ہی دکھائی دینے لگے تھے۔ جالان راجہ (JALAN RAJA) یعنی راجہ روڈ پر واقع ۔۔۔۔ ایک صدی سے بھی زیادہ یہ قدیم عمارت ریاست سیلنگور کے چوتھے سلطان عبدالصمد ابن المحرم راجہ عبداللہ کے نام سے منسوب ہے جو

۔۔۔1804ء میں پیدا ہوئے 53 برس کی عمر میں سیلنگور کی ریاست کی باگ دوڑ سنبھالی اور ۔۔۔1898ء میں یعنی تا دمِ مرگ عہدہ سلطانی پہ براجمان رہے۔ مغلیہ اور موروش طرز تعمیر کے امتزاج کی اس شاہکار عمارت کا سنگِ بنیاد۔۔۔ 1894ء میں سر چارلس مچل (SIR CHARLES MITCHELL) نے رکھا تھا جو ان دنوں۔۔۔ گورنر آف سٹریٹ سیٹلمنٹ (GOVERNOR OF THE STRAITS SETTELMENT) کے عہدے پر فائز تھے۔ ابتدا میں تو یہ عمارت برٹش ایڈمنسٹریشن کے استعمال میں تھی لیکن جب ۔۔۔ملائیشیا نے غلامی کا طوق اُتار پھینکا تو یہیں اس جگہ پر یونین جیک کا جھنڈا (UNION JACK FLAG) اتار کے ملائیشیا کا جھنڈا لہرا دیا گیا۔ انگریز چلے گئے۔۔۔ تنکو عبدالرحمٰن پرائم منسٹر بن گئے مگر یہ بلڈنگ ۔۔۔ تب بھی سرکاری دفاتر کے طور پر استعمال ہوتی رہی اور یہاں فیڈرل گورنمنٹ ۔۔۔ ہائی کورٹ ۔۔۔ کورٹ آف اپیل کے ادارے کام کرتے رہے مگر ۔۔۔ بہت اونچائی پر ہونے کی وجہ سے لوگوں کو اُترنے چڑھنے اور گاڑیاں پارک کرنے میں دشواری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ دفاتر 2000ء میں پُتراجایا منتقل کر دیے گئے۔ یہاں اب ہیریٹیج آرٹ اینڈ کلچر، منسٹری آف ٹوارزم اور ملٹی میڈیا کے دفاتر ہیں۔

ہم یہاں پہنچے تو سلطان عبدالصمد بلڈنگ کی دونوں منزلوں کے ورانڈوں سے ۔۔۔روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ بلڈنگ کے درمیان میں 41 میٹر اونچا ایک سنٹرل کلاک ٹاور تھا جس پر ۔۔۔ پیاز سے مشابہہ گنبد چمک رہا تھا۔ اس گنبد کے دائیں بائیں اسی طرح کے دو اور گنبد ۔۔۔ کلاک ٹاور کو اپنے حصار میں لئے ہوئے تھے۔ تانبے کے یہ گنبد لشکارے مارتے تھے ۔۔۔ روشنیاں ان سے پھوٹتی تھیں اور ۔۔۔ آنے والوں کو مسحور کرتی تھیں اور جب یہ ۔۔۔ گھڑیال بجتا تھا تو فضا میں ہر سو جلترنگ سے بکھر جاتے تھے۔ یہاں تراشیدہ گھاس عجب نقش و نگار بناتی تھی اور خوشنما پودوں کی تراش خراش جی لبھاتی تھی۔ ادھر ادھر طویل القامت پام

دیکھے۔۔۔۔وہ سب کچھ۔۔۔۔اس عجائب گھر میں سمو دیا گیا تھا۔ یہاں بادشاہوں کے شاہی لباس اور سامان آرائش۔۔۔۔اپنی داستانِ عظمت سناتے تھے تو دیوی دیوتاؤں کے بت۔۔۔۔آنے والوں کو اپنی طاقت کا زور دکھاتے تھے۔ پرانے وقتوں کے جنگی لباس اور آلاتِ حرب کسی جنگ کا نقشہ دکھاتے تھے۔۔۔۔مختلف قوموں کے مختلف ادوار کا منظر نامہ بناتے تھے اور سب دیکھنے والے ان مناظر کو اپنی آنکھوں میں بھرتے جاتے تھے۔ ہمیں بھی یہاں جانے کتنا ہی وقت لگ گیا تھا۔ کوالالمپور میں پہلا پورا دن بہت بھرپور گزرا تھا۔ اب شام اتر آئی تھی اور اس وقت ہم اس کلچرل شہر کی رونقیں دیکھتے ہوئے یونیورسٹی آف ملایا کی طرف جا رہے تھے۔

دھنک رنگ شام کے اُترتے ہی کوالالمپور میں گویا روشنیوں کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ سڑک کنارے ایستادہ، قطار در قطار قمقمے جل اُٹھے تھے۔ فلک بوس عمارتیں بقعۂ نور بن گئی تھیں۔ اس وقت ٹریفک کا ازدحام تھا جس میں ہم بھی شامل ہو گئے تھے۔ دن بھر تو ہم نے۔۔۔۔جون کی چلچلاتی دھوپ کی سختیاں برداشت کی تھیں اور تیز دھوپ میں۔۔۔۔یکدم ہو جانے والی بارش کے بعد گھٹن اور حبس کے کی تلخیاں سہی تھیں مگر۔۔۔۔

اب فضا میں خوشگوار خنکی در آئی تھی اور اس فرحت انگیز خنکی کے سحر میں گرفتار ہمارے باہمت داماد نے اپنی پروٹون طیارہ کا رخ ملایا یونیورسٹی کی بجائے یہ کہہ کر سلطان عبدالصمد بلڈنگ کی طرف موڑ دیا تھا کہ:۔

"اس خوبصورت بلڈنگ کو دیکھے بنا امی جان کی کوالالمپور کی سیر ادھوری رہے گی۔"

اونچی نیچی آبادی والے اس دلفریب شہر میں۔۔۔۔پہاڑی پر ہونے کی وجہ سے سلطان عبدالصمد بلڈنگ کے خدوخال دور سے ہی دکھائی دینے لگے تھے۔ جالان راجہ (JALAN RAJA) یعنی راجہ روڈ پر واقع۔۔۔۔ایک صدی سے بھی زیادہ یہ قدیم عمارت ریاست سیلنگور کے چوتھے سلطان عبدالصمد ابن المحرم راجہ عبداللہ کے نام سے منسوب ہے جو

۔۔۔1804ء میں پیدا ہوئے 53 برس کی عمر میں سیلنگور کی ریاست کی باگ دوڑ سنبھالی اور ۔۔۔1898ء میں یعنی تا دمِ مرگ عہدہ سلطانی پہ براجمان رہے۔ مغلیہ اور موروش طرز تعمیر کے امتزاج کی اس شاہکار عمارت کا سنگِ بنیاد۔۔۔ 1894ء میں سر چارلس مچل (SIR CHARLES MITCHELL) نے رکھا تھا جو ان دنوں۔۔۔ گورنر آف سٹریٹ سیٹلمنٹ (GOVERNOR OF THE STRAITS SETTELMENT) کے عہدے پر فائز تھے۔ ابتدا میں تو یہ عمارت برٹش ایڈمنسٹریشن کے استعمال میں تھی لیکن جب ۔۔۔ملائیشیا نے غلامی کا طوق اُتار پھینکا تو یہیں اس جگہ پر یونین جیک کا جھنڈا (UNION JACK FLAG) اتار کے ملائیشیا کا جھنڈا لہرا دیا گیا۔ انگریز چلے گئے۔۔۔۔ تنکو عبدالرحمٰن پرائم منسٹر بن گئے مگر یہ بلڈنگ ۔۔۔۔تب بھی سرکاری دفاتر کے طور پر استعمال ہوتی رہی اور یہاں فیڈرل گورنمنٹ ۔۔۔ ہائی کورٹ ۔۔۔ کورٹ آف اپیل کے ادارے کام کرتے رہے مگر۔۔۔ بہت اونچائی پر ہونے کی وجہ سے لوگوں کو اُترنے چڑھنے اور گاڑیاں پارک کرنے میں دشواری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ دفاتر 2000ء میں پتراجایا منتقل کر دیے گئے۔ یہاں اب ہیریٹیج آرٹ اینڈ کلچر، منسٹری آف ٹوارزم اور ملٹی میڈیا کے دفاتر ہیں۔

ہم یہاں پہنچے تو سلطان عبدالصمد بلڈنگ کی دونوں منزلوں کے ورانڈوں سے ۔۔۔روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ بلڈنگ کے درمیان میں 41 میٹر اونچا ایک سنٹرل کلاک ٹاور تھا جس پر۔۔۔ پیاز سے مشابہہ گنبد چمک رہا تھا۔ اس گنبد کے دائیں بائیں اسی طرح کے دو اور گنبد ۔۔۔کلاک ٹاور کو اپنے حصار میں لئے ہوئے تھے۔ تانبے کے یہ گنبد لشکارے مارتے تھے ۔۔۔روشنیاں ان سے پھوٹتی تھیں اور ۔۔۔ آنے والوں کو مسحور کرتی تھیں اور جب یہ ۔۔۔گھڑیال بجتا تھا تو فضا میں ہر سو جلترنگ سے بکھر جاتے تھے۔ یہاں تراشیدہ گھاس عجب نقش ونگار بناتی تھی اور خوشنما پودوں کی تراش خراش جی لبھاتی تھی۔ ادھر ادھر طویل القامت پام

لہراتے تھے اور فوٹو گرافی کے شوقین ان کے پاس کھڑے تصویریں بنواتے تھے۔ یہاں مختلف طرح کے فوارے۔۔۔۔پھواریں برساتے تھے اور بھاگتے دوڑتے بچے ببل سٹک سے بلبلے بناتے اور ہوا میں۔۔۔۔اڑاتے تھے۔ میں اپنے سامنے ایک بلند قامت درخت کو حیرت سے تکتی تھی جس کی جڑ سے۔۔۔۔دو مضبوط تنے نکلے تھے اور تھوڑی سی سنگت کے بعد۔۔۔۔اپنی راہیں جُدا کر گئے تھے۔ ان دونوں تنوں کے بیچ سے جھانکتا ہوا یہ کلاک ٹاور اپنی تمکنت دکھاتا تھا اور مجھے باور کراتا تھا کہ۔۔۔۔

یہاں آنا اچھا لگا نا۔

سچ مچ۔۔۔۔اگر میں روشنیوں کے شہر میں پور پور ڈوبی یہ عمارت۔۔۔۔یہ جلترنگ بجاتا گھڑیال اور یہاں کا مخملی تراشیدہ سبزہ نہ دیکھتی تو۔۔۔۔میری سیر ادھوری رہ جاتی۔

میں نے سوچا!

چلو کچھ دیر کو ہی سہی، بھاگتے دوڑتے سلطان عبدالصمد بلڈنگ بھی دیکھ لی۔۔۔۔بلکہ اس کے عقب میں دریائے کالانگ کے ثبت نقوش بھی نظر آئے اور قریب میں جہاں دریائے کالانگ اور دریائے گمباگ بغلگیر ہوتے ہیں وہیں۔۔۔۔سلطان عبدالصمد مسجد بڑے طنطنے کے ساتھ کھڑی دکھائی دی تھی۔ تین گنبد والی یہ مسجد، سلطان عبدالصمد بلڈنگ سے مشابہت رکھتی تھی۔ 1909ء میں بنائی گئی اس مسجد کو آرتھر بینسن ہبک (BENSIN ARTHOR HUBBUCK نے ڈیزائن کیا تھا۔ پوری ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی یہ مسجد اپنی آب و تاب برقرار رکھے ہوئے تھی۔

اپنے تاریخی ورثے کی حفاظت کرنا۔۔۔۔اسے سنبھالنا کوئی اس ملک سے سیکھے۔ میں نے رشک بھری نظروں سے مسجد جمک کو دیکھا۔ میں نے یہاں جتنی بھی قدیم عمارتیں دیکھیں ان کی رعنائی کو۔۔۔۔اس ملک کے باسیوں نے ماند نہیں پڑنے دیا تھا۔

قدیم اور شاہکار عمارتیں تو میرے دیس میں بھی ہیں۔ میرا لاہور تو تاریخی ورثے سے بھرا پڑا ہے مگر۔۔۔۔مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کے سبب یہ ورثہ شکست وریخت سے دوچار ہے۔ مغلوں کی تعمیر کردہ بہت سی عمارتیں اس شہر میں ہیں مگر۔۔۔۔اپنی ویرانی پہ نوحہ کناں رہتی ہیں۔ جس کی عکاسی اس شعر سے ہوتی ہے۔

برمزارِ ماغریباں نے چراغِ نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

اس ملک کی ترقی۔۔۔۔اس شہر کی رعنائیوں اور شادابیوں پہ رشک کرتے ہم یہاں سے نکلے اور ملایا یونیورسٹی چل دیے۔

کوالالمپور۔۔۔۔وہ خوبصورت شہر ہے جس میں سیاحوں کے گھومنے پھرنے اور دیکھنے کے لیے مقامات بے شمار ہیں۔ قدرتی حسن کے ساتھ ساتھ جدید اور قدیم فنِ تعمیر کے بھی یہاں اتنے شاہکار ہیں کہ۔۔۔۔جنہیں دیکھتے دیکھتے بندہ تھک جائے مگر۔۔۔۔اس شہر کی خوبصورتی نہ سمیٹ سکے۔ اس شہر پر ہجوم میں گاڑیاں اور سواریاں ان گنت مگر۔۔۔۔آلودگی رتی بھر نہ تھی۔ نہ مجھے یہاں کھٹارا بسیں نظر آئی تھیں اور نہ ہی دھواں چھوڑتے۔۔۔۔پھٹ پھٹ کرتے، شور مچاتے رکشا دکھائی دیے تھے۔ پبلک ٹرانسپورٹ کا نظام بھی عمدہ تھا۔ اونچائی پہ چلنے والی ایک بوگی کی میٹرو۔۔۔۔اپنے دامن میں ڈھیروں مسافر سمیٹے۔۔۔۔خصوصی ٹریک پہ آتی جاتی دکھائی دی تھی۔ بازاروں اور دکانوں پہ چھوٹے بڑے پرچم بھی۔۔۔۔جابجا نظر آئے تھے جو یہاں کی نرم گرم ہواؤں میں لہراتے تھے اور۔۔۔۔اپنے دیس کی شان بڑھاتے تھے۔ روشنیوں اور رنگوں کے اس شہر میں رات اب اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز تھی اور۔۔۔۔دن کی نسبت اس وقت ٹریفک اور لوگوں کا رش دیدنی تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس شہر کی گہما گہمی میں دن رات حائل نہیں ہوتے۔ یہاں کی نائٹ لائف کی بھی بڑی دھوم سنی تھی مگر یہ نائٹ لائف (NIGHT

LIFE) دس بجے کے بعد شروع ہوتی تھی مگر۔۔۔۔تب تک ہمارا باہر رکنا ممکن نہیں تھا کہ

۔۔۔۔

ہمارے عمر رسیدہ میزبان کھانے پہ ہمارے منتظر تھے۔ ہمارے یہ میزبان ڈاکٹر مظہر اور ان کی بیگم دونوں پاکستانی تھے اور یونیورسٹی آف ملایا کی پروفیسرز کالونی میں رہائش پذیر تھے۔ ڈاکٹر مظہر قائد اعظم یونیورسٹی میں افضال کے کیمسٹری کے استاد رہے تھے۔ استاد کو لائق فائق شاگرد ہمیشہ یاد رہتے ہیں اور طالب علم بھی۔۔۔۔ اپنے شفیق اور مہربان استاد کو کبھی نہیں بھولتے۔ ان دونوں میں بھی محبت واحترام کا تعلق تبھی سے استوار ہو گیا تھا۔ یہ بھی اتفاق ٹھہرا کہ ۔۔۔۔ڈاکٹر مظہر ریٹائر ہوئے تو ملایا یونیورسٹی نے انہیں پروفیسر آف ایمیریٹس کے عہدے کی پیش کش کر دی اور وہ ملائیشیا آ گئے۔ ادھر پیٹروناس یونیورسٹی نے سکالرشپ پہ ہمارے داماد کو پی ایچ ڈی میں داخلہ دے دیا یوں۔۔۔۔ استاد اور شاگرد پردیس میں بھی اکٹھے ہو گئے۔۔۔۔گو ریاست الگ الگ تھی مگر باہمی رابطے نے۔۔۔۔ یہاں دونوں کی دوریاں نہ آنے دی تھیں۔

افضال نے جب سے ڈاکٹر مظہر کو اپنی خوش دامن کے آنے کی خبر دی تھی۔ وہ ادب سے کچھ خاص لگاؤ نہ رکھتے ہوئے بھی ایک پاکستانی ادیبہ سے ملنے کے خواہش مند تھے۔ ہمارا یہ تین روزہ سیاحتی پروگرام ان کے اصرار پر ترتیب دیا گیا تھا۔ ہفتہ اتوار یونیورسٹی بند تھی۔ جمعے کی افضال نے چھٹی لے لی تھی اور یوں۔۔۔۔ ہم نے پہلا پورا دن کے ایل کی سرمئی، سڑکوں پر دوڑتے بھاگتے گزار دیا تھا اور اب۔۔۔۔

کوالالمپور کے شمال مغرب میں 1750 ایکڑ کے وسیع رقبے پر پھیلی اس وسیع و عریض یونیورسٹی میں آ گئے تھے۔

ہم جب پروفیسر آف ایمیریٹس کے بڑے سے گھر میں داخل ہوئے تو۔۔۔۔ ایک عالمانہ خاموشی نے ہمارا استقبال کیا۔ مکانیت زیادہ ہو اور مکین کم تب۔۔۔۔ ایسی خاموشی ہی

آنے والوں کو خوش آمدید کہتی ہے۔ تنہائی بھری اس خاموشی نے مجھے خوفزدہ سا کر دیا۔ اتنے بڑے اس گھر میں ڈاکٹر مظہر اور ان کی بیگم تھے یا پھر۔۔۔ تنہائی کہ ان کے دونوں بیٹے نہ ۔۔۔ پاکستان میں رہ پائے اور نہ والدین کے ساتھ رہے تھے۔ حصولِ علم اور حصولِ رزق نے دونوں کو امریکہ میں اُلجھا دیا تھا۔

قانون فطرت بھی یہی ہے ۔۔۔ پرندے اڑانیں بھرا ہی کرتے ہیں۔ ۔۔۔ نئے آشیانے بھی بناتے ہیں مگر جڑت بھی تو انسانی تقاضا ہے۔

مانا! پوری دنیا گلوبل ویلیج بن گئی ہے۔ دوریاں بھی اب دوریاں نہیں لگتیں مگر پھر بھی ہم اپنے پیاروں، اپنے دلداروں سے جُڑے رہنا چاہتے ہیں ۔۔۔ اپنے بچوں کو اپنے قریب دیکھنا چاہتے ہیں ۔۔۔ ان کے بچوں کی کلکاریاں سننا چاہتے ہیں مگر اب ۔۔۔

زمانہ بدل گیا ہے ۔۔۔ قدریں بھی بدل گئی ہیں ۔۔۔ خوب سے خوب تر کی جستجو نے ہمیں تنہا کر دیا ہے۔ ہم وقت سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔ مجھے منیر نیازی کی اک چھوٹی سی پنجابی نظم یاد آ گئی

ویلے توں اگے لنگن دی سزا
بندہ کلّا رہ جاندا اے

ڈاکٹر مظہر تھے تو سائنسی آدمی مگر ۔۔۔ ان کی حسِ مزاح خاصی تیز تھی۔ ابھی گپ شپ ہو رہی تھی کہ کھانا لگا دیا گیا اور یہ کام ۔۔۔ کسی ملازم نے نہیں بلکہ میری بیٹی اور ڈاکٹر صاحب کی بیگم نے کیا کہ یہاں کہیں مجھے نوکر نام کی کوئی چیز دکھائی نہیں دی تھی۔ کھانے کے بعد انہوں نے بہت کہا کہ پسار مالم (رات کو سڑک کنارے لگائے گئے سٹال) دیکھ آئیں مگر ۔۔۔ ہم نہیں گئے کہ دن بھر کی تھکن نے پاؤں پسار لئے تھے۔

❁

کوالالمپور میں بسنت

ملایا یونیورسٹی کی پروفیسرز کالونی کی پرسکون فضا میں نیند تو خوب گہری آئی تھی مگر ---آنکھ معمول کے مطابق سویرے ہی کھل گئی تھی۔

میں نے کھڑکی کا پردہ سرکایا۔ اک دلفریب منظر میرے سامنے تھا۔ صبح ابھی پوری طرح نمودار نہیں ہوئی تھی۔ سامنے جہاں تک میری نظر جاتی تھی ---خوب صورت تراشیدہ پودے دکھائی دیتے تھے۔ ربڑ اور پام سرمستیاں کرتے تھے اور پرندوں کے غول تلاش رزق میں سرگرداں بھٹکتے پھرتے تھے۔ سورج نے ابھی سنہری کرنوں کا جال نہیں بچھایا تھا اور پھر ---میرے دیکھتے ہی دیکھتے ہر سمت روشن اجالا پھیل گیا تھا۔

میں تیار ہوئی اور باہر لاؤنج میں چلی آئی جہاں ---ناشتہ ہمارا منتظر تھا۔ انگریزی اور پرہیزی ناشتے کے ساتھ پاکستانی ناشتہ بھی موجود تھا۔ ڈاکٹر مظہر اور ان کی دھان پان سی بیگم نے پاکستانی ناشتے کا اہتمام ہمارے لیے کیا تھا کہ وہ خود تو ---ہلکا پھلکا پاکستانی ناشتہ کرتے تھے اس لئے وہ جو کا دلیہ، شہد اور دودھ سے مستفید ہوئے لیکن ---بصد اصرار ہمیں تگڑا ناشتہ کرایا کہ ہمیں ---ابھی سفر کے بہت سے مراحل جو طے کرنا تھے۔ ٹھیک سات بجے ہم نے اپنے میزبان جوڑے کو خدا حافظ کہا اور سات سو پچاس ایکڑ رقبے پر پھیلی ملائیشیا کی اس پہلی یونیورسٹی پہ الوداعی نظر ڈال کے باہر نکل آئے جس کے گھنے درخت ---تراشیدہ پودے اور

مختلف رنگوں کے پھول ہمیں اس ملک کی شادابی کا یقین دلاتے تھے۔

کوالالمپور کی کشادہ سڑکیں اس وقت بھی ٹریفک کے انبار تلے دبی ہوئی تھیں گویا ۔۔۔اس شہر میں صبح سانجھرے ہی زندگی اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ رواں تھی۔ دھوپ کا رنگ ابھی سنہرا تھا اور آسمان کا رنگ گہرا نیلا ہو رہا تھا جس پہ سفید بادلوں کی اِکا دُکا ٹکڑیاں منڈلا رہی تھیں اور ان بادلوں کے درمیان۔۔۔اک پنج رنگی ہلکورے لیتی پتنگ مجھے حیرت زدہ کر گئی تھی کہ اس شہر جدید میں بھی کوئی۔۔۔پتنگ باز دیوانہ اپنی نیند کی قربانی دے کے پتنگ بازی کا شوق پورا کر رہا تھا۔ گہرے نیلے آسمان تلے ڈولتی ہوئی یہ تنہا پتنگ میرا دل اپنی گرفت میں لے رہی تھی

یہ تو ہمارے شوق ہیں۔۔۔ہمارے تہوار ہیں۔میں نے سوچا۔

میری آنکھوں میں لاہوری بسنت کے کئی منظر سمٹ آئے۔ بسنت جو کبھی ہمارا تہوار ہوا کرتی تھی۔ابھی کچھ برس پہلے تک ہمارے ہاں بسنت بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ مہینوں پہلے سے اس تہوار کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ مختلف ڈیزائنوں کی رنگ برنگی پتنگیں۔۔۔گڈیاں اور بڑے بڑے گڈے تیار کیے جاتے۔ کھلے میدانوں میں لوگ ڈور کو مانجھا لگانے کا فریضہ ادا کرتے دکھائی دیتے اور جب بسنت آتی تو۔۔۔بہت سے شوقین بسنت کا تہوار منانے دوسرے شہروں سے لاہور پہنچ جاتے۔ ہمارا کرشن نگر والا تین منزلہ ننیہالی گھر مہمانوں سے بھر جاتا۔ ہماری ایک نک چڑھی چھوٹی خالہ۔۔۔ڈھیر سارے مہمانوں کو دیکھ کے ناک بھوں چڑھانے لگتیں مگر۔۔۔ہماری چھوٹی اماں روایتی عورتوں کی طرح داری آنے والوں پہ صدقے واری جاتیں۔ اپنے بھتیجوں اور ان کی اولادوں کی خاطر داری میں لگ جاتیں۔خالہ جان۔۔۔خالہ اماں۔۔۔ممانی صاحب اور دیگر ممانیاں طرح طرح کے کھانے بنایا کرتیں جبکہ ہم لڑکیوں کی ڈیوٹی چپاتیاں بنانے پہ لگا دی جاتی کہ تب۔۔۔

ہمارے گھروں میں بازار سے روٹی منگانا پھوہڑپن کی علامت سمجھا جاتا تھا سو ہم بے چاریاں ۔۔۔کئی کئی کونڈے آٹا چپاتیوں میں ڈھالتیں۔ اس دوران "بوکاٹا" کی زوردار آوازیں سنائی دیتیں تو۔۔۔۔ہم سب کا جی بھی یہ نظارا دیکھنے کو مچل جاتا مگر۔۔۔۔ہمارے ماموں صاحب (ہم سب کے انٹرنیشنل ابا جو دیال سنگھ کالج میں شعبۂ فارسی کے استاد رہے) کی خشمگیں نگاہیں ہمارا خون خشک کر دیتیں اور۔۔۔۔ہم سب کزن لڑکیاں جی مسوس کے رہ جاتیں کہ۔۔۔۔گھر میں اتنی سخت مزاجی جبکہ دیال سنگھ کالج میں ان کی خوش مزاجی مشہور تھی۔ جس کی تعریف اور تصدیق اداکار ناصر نقوی۔۔۔۔شاعر، ٹی وی سلیم طاہر اور شاعر افضال شاہد کیا کرتے تھے۔ یہ تینوں ان کے شاگرد تھے جنہوں نے صحافت اور اداکاری میں بہت نام کمایا۔

وہ دور تو اب قصۂ پارینہ ہوئے۔ بسنت۔۔۔۔حکومتی پابندیوں اور لوگوں کے غلط رویوں کی نذر ہو گئی۔ گھر کے بڑوں نے مٹی اوڑھ لی اور۔۔۔۔ان کے رخصت ہوتے ہی ستائیس کمروں والا ہمارا ننھیالی گھر خاموشیوں میں ڈوب گیا۔۔۔۔ جہاں رونقیں آباد تھیں۔۔۔۔سناٹے وہاں نوحہ خواں ہوئے۔۔۔۔گھروں کی جُڑت ٹوٹی تو پنچھیوں نے بھی ٹھکانے بدل لئے اور بقول احمد مشتاق

اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے
اور اب کوئی کہیں، کوئی کہیں رہتا ہے

ہماری گاڑی پارلیمن روڈ سے گزر رہی تھی۔ سرسبز و شاداب اس علاقے میں ایک طرف تو بنگونان پارلیمن یعنی پارلیمنٹ ہاؤس تھا اور۔۔۔۔دوسری طرف پتراجایا کی خوبصورت عمارتیں تھیں۔

پتراجایا (PUTRAJAYA):

یہ کوالالمپور کا نیا بسایا ہوا علاقہ ہے۔ جس کی بنیاد مہاتیر محمد نے۔۔۔۔جدید ملائیشیا

بناتے ہوئے رکھی اور یہاں فیشن ایبل بستی بسائی۔ یہ کوالالمپور میں ہی ایک الگ بنایا گیا منظم شہر ہے۔ جہاں سمندر کا ایک گوشہ تراش کے پانی کا رخ موڑ دیا گیا اور اک مصنوعی جھیل بنا ڈالی۔ اس مصنوعی جھیل کنارے اک خوبصورت آٹھ میناروں والی گلاب کے رنگ والی مسجد دکھائی دے رہی تھی۔ جس کا ایک بڑا مرکزی گنبد بھی تھا جو۔۔۔ آسمان کی بلندیوں کو چھونے کی کوششوں میں تھا۔ یہ پُتراجایا مسجد تھی۔ ملائیشیا کی خوبصورت ترین مسجد، جس کے تیز گلابی رنگ کا عکس جب اس مصنوعی جھیل کے پانی میں ہلکورے لیتا تو ساری جھیل گلابی ہو جاتی تھی۔

اس گلابی مسجد نے مجھے PINK CITY کی یاد دلا دی۔ مجھے اس میں جے پور کی شبیہہ دکھائی دینے لگی۔ 2000ء میں امن وفد کے ساتھ انڈیا گئی تو اس گلابی شہر نے۔۔۔ مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ جے پور کے نئے علاقے۔۔۔ نئی کالونیاں تو مختلف رنگوں کی عمارتوں پر مشتمل تھیں مگر اصل جے پور میں تو۔۔۔ ہر طرف گلابی رنگ بکھرا ہوا دکھائی دیتا تھا تبھی جے پور (پنک سٹی) کہلاتا تھا۔

پُتراجایا کی اس گلابی مسجد کی تعمیر میں انسانی ہاتھوں کی کرشمہ سازی مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال گئی تھی۔۔۔ پتراجایا کی اس جدید بستی میں خوبصورت عمارتیں تھیں۔۔۔ مصنوعی جھیلیں تھیں۔۔۔ سیاحوں کی ٹولیاں تھیں۔۔۔ بھانت بھانت کی بولیاں تھیں۔۔۔ پورے اور ادھورے ملبوس تھے مگر۔۔۔ اس مسجد کے اندر جانے کے لیے ادھورے لباس کو بھی پورا کرنا ضروری قرار دیا گیا تھا تبھی تو۔۔۔ غیر ملکی، غیر مسلم۔۔۔ مرد و زن بدن ڈھانپے مسجد میں پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ گلابی رنگت والی گوریاں بڑا سا عبایا/ گاؤن پہنے، سکارف سے سر کو ڈھانپے مسجد میں چلتی تھیں تو۔۔۔ اپنے نازک سے وجود پہ عبایا کا بھاری بوجھ اٹھانا انہیں دشوار لگتا تھا۔ وہ چلتے چلتے لڑکھڑا جاتی تھیں مگر۔۔۔

یہ جو شوق ہے نا۔ یہ سب کام کرا دیتا ہے۔ منی اسکرٹ پہننے والیوں کو بھی عبایا پہن کے

چلنا سکھا دیتا ہے۔ سورج کی نرم گرم کرنوں نے جھیل کے پانی کو بھی سنہرا کر دیا تھا اور مسجد کا گلابی عکس۔۔۔۔ اس سنہرے پن کو اور بھی حسین بنا رہا تھا۔ مسجد پترا جایا جھیل کے پانی میں ہلکورے لے رہی تھی اور ہم۔۔۔۔ ان ہلکوروں سے محظوظ ہو رہے تھے کہ اچانک۔۔۔۔ موسم بے ایمان ہو گیا۔

یہاں کی بارشیں بھی خوب ہیں۔ پلک جھپکتے میں گرجتے چمکتے بادلوں کی اوٹ سے اپنا آپ دکھاتی ہیں اور۔۔۔۔ فضا میں حبس گھول کے چلتی بنتی ہیں۔

اس بارش نے سب پات شجر مزید نکھار دیے تھے۔ پترا جایا کی ہریالی کچھ اور چمکدار ہو گئی تھی۔ سرسبز پودے آنکھوں کو ٹھنڈک دیتے تھے اور مٹی کی سوندھی خوشبو من مہکائے جاتی تھی۔

یہ بارشیں بھی کیا کیا یاد دلا دیتی ہیں؟

ہمارے چھٹیوں کے دن اور ساون بھادوں کے مہینے اکثر پاکپتن 37SP میں گزرتے تھے۔ جہاں حویلی کے بڑے سے آنگن میں لگے برگد، نیم اور بیری کے درختوں پہ بشیراں جولاہی کے تیار کردہ موٹے رسوں کی پینگیں ہماری منتظر ہوا کرتی تھیں۔

کیا زمانہ تھا۔۔۔۔ تب بات بے بات خوشی انگ انگ سے پھوٹتی تھی اور ہماری پینگوں کی اڑان اونچی۔۔۔۔ کچھ اور اونچی ہوتی جاتی تھی۔

تب بیسن کی مِسّی روٹی لہسن کی چٹنی، لیموں، آم اور لسوڑوں کے اچار کے ساتھ چاٹی کی لسی اور جست کی بڑی سی ٹب میں ٹیوب ویل کے ٹھنڈے ٹھار پانی میں بھگوئے گئے آم۔۔۔۔ ہماری زندگی کی سب سے بڑی عیاشی۔۔۔۔ سب سے بڑی خوشی ہوا کرتے تھے۔ بارشیں تب بھی اچھی لگتی تھیں، بارشیں اب بھی اچھی لگتی ہیں۔۔۔۔ یہ کسی موسم میں برسیں۔۔۔۔ اپنے سحر سے نکلنے نہیں دیتیں، زندگی کی تپتی دوپہر میں اب بھی ساون جی موہ لیتا ہے۔

بارش خوب زورازور برسی اور پھر تھم بھی گئی لیکن حبس دونا کر گئی۔ اسی حبس اور گھٹن کی فضا میں ہم ملائیشیا کے کنگ پیلس چلے آئے جس کے مرکزی دروازے کے دونوں طرف ۔۔۔سفید اور سیاہ گھوڑوں پہ بیٹھے جوان، لبوں پہ مسکان سجائے سب کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ اس محل کی زیارت کو آنے والے ان گھوڑوں کی باگیں تھام کے جب تصویریں بنواتے تو اس دوران۔۔۔ یہ سدھائے گئے گھوڑے تصویرِ بتاں بنے رہتے تھے۔

کنگ پیلس کے مرکزی دروازے پہ سیاحوں کا ہجوم دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اور میں ۔۔۔اپنے رعونت بھرے حکمرانوں کے محلات سے اس کا موازنہ کرنے لگی جن کے محلات کے مرکزی دروازے تک جانا تو کُجا۔۔۔ ان محلات کی حدود میں داخل ہونا بھی عام آدمی کے لئے ناممکنات میں سے ہے۔ ہر طرف سیکیورٹی۔۔۔ خاردار تاریں۔۔۔ اور خفیہ کیمرے سب کا رستہ روک دیتے ہیں۔

میں پتراجایا کی گلابی مسجد کے سحر سے نکل کے۔۔۔ شاہی محل کے حیرت کدے کو آنکھوں میں بھرنے کے بعد اب لیک گارڈنز (LACK GARDENES) آ گئی تھی۔ کئی ایکڑوں پر پھیلے اس لیک گارڈنز میں کبھی۔۔۔ برطانیہ کے اعلیٰ سرکاری افسران رہائش پذیر تھے۔ یہ اِن دنوں کی بات ہے جب۔۔۔ ملایا برطانوی کالونی ہوا کرتا تھا۔ اب یہاں بہت سے حسین باغات ہیں۔ لیک گارڈنز دراصل باغات کا مجموعہ ہے۔ بہت سے پارکوں کا مجموعہ ہے ۔ یہاں بٹر فلائی پارک (Butterfly Park) ہے۔ برڈ پارک ہے۔ ہرنوں کا پارک ہے اور بڑی سی جھیل ہے۔ جہاں کشتی رانی کی جاتی ہے۔ ان بہت سے باغات میں جانے کے لیے ہمارے پاس وقت تھا اور نہ ہمت کہ۔۔۔ سورج اب آگ برسانے لگا تھا۔ جسم و جاں لُو کے تھپیڑوں سے جھلس رہے تھے۔ حبس سے دم گھٹا جاتا تھا سو۔۔۔ دیگر باقی پارک اور باغات کو یونہی سرسری نظر سے دیکھ کے ہم برڈ پارک چلے آئے تھے مگر۔۔۔ برڈ پارک آنے سے پہلے ہم

نے ۔۔۔ملائیشیا کی ایک قومی یادگار پہ حاضری دی تھی جسے ۔۔۔مقام یادگار شہداء کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں ایک خاصے اونچے مقام پر فوجی جوانوں کے کانسی کے بنے مجسمے نصب کئے گئے تھے ۔ جن کے ایک ہاتھ میں ملائیشیا کا پرچم تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ ۔۔۔اپنے زخمی ساتھیوں کو سنبھالنے کی تگ ودو کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ یہ ان سات فوجیوں کے مجسمے تھے جنہوں نے 1945ء سے 1960ء کے درمیان کمیونسٹوں کے خلاف گوریلا جنگ میں اپنی جانیں نچھاور کی تھیں۔ ان فوجیوں کی حُب الوطنی کو سیلوٹ کرتے ہوئے ہم (BIRD PARK) برڈ پارک چلے آئے تھے۔

اس برڈ پارک میں آبشاریں تھیں ۔۔۔تالاب تھے ۔۔۔ان تالابوں میں تیرتی بطخیں تھیں اور ۔۔۔مختلف النوع پرندے تھے جو ۔۔۔ادھر سے اُدھر اڑتے پھرتے تھے۔ یہ برڈ پارک 1991ء میں بنایا گیا تھا۔

یہ ورلڈ لارجسٹ فری فلائٹ واک ان اویری پارک (WORLD'S LARGEST FREE FLIGHT WALK IN AVIARY) تھا۔ جہاں ہر قسم کے پرندے بنا کسی ڈر خوف کے آزادانہ مٹر گشت کر رہے تھے ۔ یہ سب پرندے کچھ یوں سدھائے گئے تھے کہ یہ خود یہاں آنے والوں کے ۔۔۔بازوؤں، شانوں اور سر پر بیٹھتے تھے اور ۔۔۔کیمرے کو پوز دیتے تھے۔ جب تصویر بنوالی جاتی تو یہ پھُر سے اُڑ جاتے تھے۔ یہاں فوٹو گرافی کے لئے ایک خاص بوتھ بنایا گیا تھا جہاں ۔۔۔سیاحوں کے بازوؤں اور شانوں پہ خوبصورت پرندے بٹھا کر تصویر کشی کی جارہی تھی ۔ تصویر تو یہاں ہم نے بھی بنوائی جو چند منٹ بعد ۔۔۔ہمیں قیمتاً دے دی گئی ۔ اس پارک میں کچھ تو دیکھے بھالے پرندے تھے اور کچھ ایسے تھے جو ۔۔۔عمر کی نصف صدی گزار دینے پر بھی نہیں دیکھے جا سکے تھے۔

پرندے ہمارے آس پاس آتے تھے ۔۔۔بلا خوف وخطر بھاگے پھرتے تھے

۔۔۔مستیاں کرتے تھے اور اُڑ جاتے تھے۔ مور ناچتے تھے اور جی کو خوشی سے بھر جاتے تھے۔ ایک مور تو کچھ یوں ناچ رہا تھا جیسے۔۔۔۔ چاہتا ہو کہ ہم اس کے دلنشین رقص کو دل پہ نقش کر لیں ۔۔۔آنکھوں میں بھر لیں۔ اک نیل کنٹھ اپنی سریلی آواز سے دل پر چا رہا تھا اور ۔۔۔مختلف رنگوں کی بلبلیں بھی چہکتی مہکتی پھرتی تھیں۔ ملائیشیا کے جنگلوں میں پروان چڑھنے والا شاہی النسل پرندہ ہارن بل (HORN BILL) بھی ان سب پرندوں میں گھُلا ملا نظر آیا تھا بلکہ یہاں تو میں نے۔۔۔۔ چِٹّا کاں یعنی سفید کوے کے دیدار بھی کر لئے تھے۔ اس برڈ پارک میں طرح طرح کے زمینی، آبی اور جنگلی پرندے آزادانہ گھومتے پھرتے تھے ۔۔۔لوگوں کا دل لبھاتے تھے اور ان کی اس پارک کی سیر کو یادگار بناتے تھے۔ یہ سب اپنے ملک کی اکانومی کو مضبوط کرنے میں اپنا کردار ادا کرتے تھے کہ۔۔۔ ملائیشیا کی سیر کو آنے والا تقریباً ہر شخص۔۔۔۔ یہاں آنا ضروری خیال کرتا تھا اور ہر سیر گاہ۔۔۔۔ ہر پارک پہ ٹکٹ کا ہونا اس بات کا ثبوت تھا کہ یہ ملک یونہی ترقی نہیں کر گیا۔۔۔۔

یونہی ایشین ٹائیگر نہیں بن گیا۔ اس ملک کو سنبھالنے والے۔۔۔۔ اس ملک میں ٹوارزم کو فروغ دینے والے۔۔۔۔ اپنے ثقافتی ورثے کی حفاظت کرنے والے ہی اس ملک کی ترقی کی راہیں ہموار کئے ہوئے تھے۔ جس کی گواہی نیل کنٹھ اپنی حد سے زیادہ سریلی آواز میں دیتا تھا اور پھُدکتی ہوئی چڑیاں۔۔۔۔ مینائیں اور فاختائیں بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتی تھیں۔ ان من موہنی صداؤں اور آزادانہ فضاؤں کو چھوڑ کے آگے جانا آسان تو نہیں تھا مگر۔۔۔۔ کوئی بھی جگہ مستقل قیام کی نہیں ہوتی سو ہم۔۔۔۔ قدرت کی ان حسین مخلوقات کو خدا حافظ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

ارادہ تو یہی تھا کہ ملائیشیا کے جنگلوں میں پلنے بڑھنے والے پرندے HORN BILL کے نام سے منسوب کئے گئے ہارن بل ریسٹورنٹ میں کھانا کھائیں مگر۔۔۔۔ اس

خوبصورت ریسٹورنٹ کے دام ہمارے بجٹ سے مطابقت نہیں رکھتے تھے کہ داماد صاحب ابھی سٹوڈنٹ تھے اور میں پردیسن بھی زادِراہ کچھ زیادہ نہ لائی تھی اس لئے ہم لیک گارڈنز کے اس مہنگے ریسٹورنٹ کو دور سے ہی الوداع کہتے ہوئے (Brick Fields) چلے آئے جہاں۔۔۔۔ ہر طرح کا پاکستانی کھانا مناسب دام کے ساتھ دستیاب تھا۔ ہم جہاں جاتے تھے۔لگتا تھا کہ ۔۔۔۔سارا ہجوم اسی طرف کا رُخ کر گیا ہے۔ یہاں بھی یہی حال تھا۔ کانوں پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ اس پہ ہلکی ہلکی موسیقی کا طوفان بھی اٹھ رہا تھا اور بھوک نے بھی ہلچل مچا رکھی تھی۔ یہاں ہم نے باربی کیو کے علاوہ ایک اور اسپیشل ڈش ساتے منگوائی۔ ایک بے حد لذیذ ڈش تھی یہ ساتے۔

مونگ پھلی کی سوس میں تیار کیا ہوا گوشت اتنا مزے کا تھا کہ ہم نے۔۔۔۔ باربی کیو سے آنکھیں چرائیں اور ساتے سے لطف اندوز ہونے لگے۔

باتو کے غار اور لارڈ موروگان

جانا تو ہمیں اب گینتھنگ ہائی لینڈ (Ganthing High Land) تھا مگر ۔۔۔۔وہاں جا سے پہلے، ذرا دیر کو یہ باتو کے غار (Batu Caves) بھی تو دیکھنا تھے جو کوالالمپور سے شمال کی طرف اندازاً پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھے۔ یہ غار دور سے ہی نمایاں ہونے لگے تھے۔

دھندلے دھندلے۔۔۔۔مٹیالے سے سفید اور پیلے پتھروں والے ان غاروں کے بارے میں تاریخ بتاتی ہے کہ یہ غار 1878ء میں دریافت کئے گئے اور ان کی دریافت کا سہرا ۔۔۔۔ایک امریکی ولیم ہارنیڈی (Willian Hornaday) کے سر ہے۔ اب یہ غار ہندو یاترا کا مرکز بنے ہیں۔ دریائے باتو۔۔۔۔یہیں کہیں اس پہاڑ کے قریب سے گزرتا ہے۔ یوں اس دریا کی نسبت سے یہ غار۔۔۔۔باتو کیوز (Batu Caves) کہلاتے ہیں۔

کہتے ہیں یہ غار لائم سٹون (Lime Stone) چونے کے پتھر سے بنے ہیں ۔چونے کا یہ پتھر گزرتے وقت کے ساتھ ماربل کا روپ دھار لیتا ہے لیکن۔۔۔۔اسے اس حال تک پہنچنے میں کئی سو سال درکار ہوتے ہیں۔ ان باتو کیوز کو دریافت ہوئے بھی اب تقریباً ڈیڑھ صدی ہونے کو تھی۔ یوں اب یہ غار بھی ماربل کا روپ دھار گئے تھے۔

اک بلند و بالا پہاڑ اور اس پہاڑ پر بہت سے غار تھے۔

ان غاروں کے اندر بنے ہوئے مندر، آرٹ کا بہترین شاہکار تھے۔

شوخ رنگوں سے مزین بتوں کی ان غاروں میں بھر مار تھی اور ---لنگیاں کسے ہوئے ننگے بدن سنتوں--- مہنتوں کی یلغار تھی جو--- آتے جاتے یاتریوں سے دان کی وصولی کرنے میں مصروف تھے۔ یہاں ایک بلند ترین سنہری مجسمہ ایستادہ تھا۔ سونے کے خول میں مڑھا ہوا یہ مجسمہ--- دور سے ہر آنے والے کی توجہ اپنی جانب کھینچتا تھا اور اس سنہری مجسمے کے دیدار کی طلب رکھنے والوں کی تعداد تھی کہ--- بڑھتی ہی جاتی تھی۔ جن میں زیادہ تعداد ہندوؤں کی تھی کہ یہ ان کا مقدس مقام جو ٹھہرا۔

یہ لارڈ موروگان (Lord Murgan) کا مجسمہ ہے۔ جو ہندو دیوتاؤں میں سب سے زیادہ مقبول ہے۔ تامل ہندوؤں میں لارڈ موروگان سے بہت عقیدت پائی جاتی ہے۔ شمالی انڈیا، سری لنکا، انڈونیشیا، ملائیشیا اور سنگاپور میں ان عقیدت مندوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

صرف ملائیشیا میں ہی طاقت، جوانی اور نیکی کے اس دیوتا کے چار بڑے مندر ہیں ۔جن میں کوالالمپور میں باتو کیوز (Batu Caves) میں، اپوہ میں Kallumalai ---پینانگ میں Tanneermalai اور ملاکا میں Sannasi Malai ٹیمپل قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں بھگوان (Subramaniyam)، سبرامنیم کے ماننے والے---ان کے عقیدت مند---اپنے چہرے اور جسم کے گوشت اور کھال میں سٹیل کے ہک پروتے ہیں اور اُف تک نہیں کرتے تو دنیا بھر سے آئے ہوئے سیاح---ان کی یہ عقیدت دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ اپنے بھگوان سے عقیدت ان کو درد کی شدت سے غافل کر دیتی ہے۔

کہتے ہیں جب یہاں تھائی پوسام کا میلہ لگتا ہے تب--- سٹیل کے ہک جسم میں پرونے والوں کی اکثریت--- دکھائی دیتی ہے اور حیرت زدہ کر جاتی ہے۔ ہمیں اسی سبرامنیم دیوتا کے سنہری مجسمے کی پُشت کے پاس سے اوپر جاتی شوخ رنگوں کی سیڑھیاں طے کر کے ان

غاروں تک پہنچنا تھا اور۔۔۔ان مندروں کو دیکھنا تھا۔ مگر افضال نے ان سیڑھیوں کی تعداد بتا کر میرے ہوش اڑا دیے تھے۔ 272 سیڑھیاں چڑھنے اور پھر اترنے کے خوف نے لمحہ بھر کو تو مجھے لرزا ہی دیا تھا۔ مجھے اپنے بیمار گھٹنوں پہ ترس آنے لگا تھا مگر۔۔۔شوق یہ سب زینے طے کروانے کی ٹھان چکا تھا سو۔۔۔میں نے بچوں کی تقلید کرتے ہوئے قدم بڑھا دیے۔

پہاڑ کی چڑھائی چڑھنا اتنا آسان بھی نہ تھا۔ ہانپتے کانپتے ابھی نصف رستہ ہی طے کیا تھا کہ اک طرف۔۔۔مڑتا ہوا رستہ سامنے آ گیا بچے بھی ادھر ہی مڑ گئے تھے۔ میں نے لمحہ بھر کو یہاں رکنا چاہا مگر جنگلی بندروں کی دلیری نے مجھے بوکھلا دیا۔ جو آزادانہ ادھر ادھر اُچھلتے پھر رہے تھے۔۔۔چھینا جھپٹی کر رہے تھے اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک سفید فام عورت کا ہینڈ بینگ اُڑا لے گئے تھے۔ وہ بے چاری انگریزی میں واویلا کرتی رہی اور بندر اُس کا مال۔۔۔ اُس کے سامنے ہی اُسے دکھا دکھا کر کھاتے رہے۔ کسی بندر نے چپس کا پیکٹ پھاڑ ڈالا، کوئی جوس لے بھاگا اور دوسرے بندر اس بھاگنے والے بندر کا پیچھا کرنے لگے۔ میں نے خوفزدہ ہو کر مضبوطی سے اپنا بیگ تھاما اور آگے بڑھ گئی۔ یہاں بہت سے چھوٹے چھوٹے غار تھے۔ جن میں گھُپ اندھیرا تھا۔ شدید حبس تھا۔ تعفن اور سیلن کی بساند تھی اور ان قدیم غاروں کی چھتوں سے لٹکتی ہوئی چمگادڑیں تھیں۔ ان غاروں کی گزرگاہیں قدیم لاہور کے اندرون موچی گیٹ اور لوہاری گیٹ کی گلیوں جیسی تنگ تھیں۔ اندر گھٹن اور ہوش اڑاتی گرمی تھی۔۔۔اڑتی ہوئی چمگادڑیں تھیں اور باہر پھُدکتے بھاگتے چھینا جھپٹی کرتے بندر تھے۔ یہ سب دیکھ کے میرا ارادہ بدل گیا تھا اور میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے تھے۔

میں نے سفید اور ہلکے پیلے پتھروں والی ان غاروں پہ ایک الوداعی نظر ڈالی اور یہاں کا مرکزی مندر دیکھے بنا ہولے ہولے وہی سیڑھیاں اترنے لگی جنہیں طے کرنے سے پہلے میں نے کئی بار سوچا تھا۔

میں نیچے اتر آئی اور باتک فیکٹری دیکھنے لگی۔

باتک۔۔۔ ملائیشیا کی ایک مشہور سوغات ہے۔ جس میں کپڑے پر بہت نفاست اور مہارت سے نقش ونگار چھاپے جاتے ہیں۔ رنگائی اور چھپائی کی کئی فیکٹریاں یہاں کام کر رہی تھیں ۔ جنہیں آنے والے شائقین کو خاص طور سے وزٹ کرایا جارہا تھا۔ یہ فن یہاں انڈونیشیا سے آیا تھا اور اب ملائیشیا کی پہچان بنا ہوا تھا۔ باتک ہمارے ہاں کی اجرک کی طرح کا کپڑا ہوتا ہے۔ جس پر موم سے ڈیزائن بنا کے اس کو رنگ دیا جاتا ہے۔ جہاں جہاں موم لگا ہو وہاں پہ رنگ نہیں آتا۔ باقی تمام کپڑے پہ رنگ آجاتا ہے پھر گرم پانی میں کپڑا ڈبو کر جب موم اتار دیا جاتا ہے تو کپڑے پر دیدہ زیب ڈیزائن بن جاتے ہیں۔

میں کہیں بھی جاؤں۔۔۔ کسی ملک یا کسی شہر میں گھوموں، شاپنگ کبھی میرا مسئلہ نہیں رہی سو۔۔۔ میں نے اس خوبصورت باتک کو دیکھا۔۔۔ سراہا اور چھوڑ دیا کہ جب میرے دیس میں۔۔۔ میرے سندھ میں ہر طرح کی اجرک موجود ہے تو پھر۔۔۔ خوانخواہ یہاں سے خریدوں۔۔۔ جیب خالی کروں اور وزن اٹھالے جاؤں بس اسی لئے میں نے پام کے پتوں سے بنی خوبصورت ٹوکریوں پہ اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور چینی کوزہ گروں کی مہارت کی داد دیتے ہوئے آگے بڑھ گئی جہاں رستے میں سڑک کے دونوں طرف چھابڑیاں لگی تھیں۔ سڑک کنارے ناریل اور اناس بیچتی ملائیشین لڑکیاں اپنی ملایا بھاشا میں آوازیں لگا رہی تھیں۔ ایک سلونی سی لڑکی تو مسکراتے ہوئے اشارے بھی کیے جاتی تھی۔ میں وہیں رُک گئی مگر یہاں مجھے اس کی مسکراہٹ نے نہیں پیاس کی شدت نے رکنے پر مجبور کیا تھا۔ جون کی چلچلاتی دھوپ نے بے حال اور حبس نے نڈھال کر رکھا تھا۔

افضال نے اس لڑکی سے اسی کی زبان میں کچھ کہا!

لڑکی نے مسکراتے ہوئے جھٹ ایک بڑا سا چھرا ناریل کے اوپر والے حصہ پر رکھ کر

جھٹکا دیا اور ناریل میں اسٹرا ڈال کے مجھے تھما دیا۔ ناریل پانی نے گرمی کی شدت کو قدرے کم کر دیا تھا۔

میں نے دیکھا خواتین کی خاصی تعداد یہاں سڑک کنارے کاروبار کر رہی تھی۔ انہیں یہاں کسی چھیڑ چھاڑ کا ڈر تھا اور نہ ہی۔۔۔ کسی بُری نظر کا خوف تھا کیونکہ یہ ملائیشیا ہے۔ یہاں لوگ مذہبی اقدار کی پاسداری کرتے ہیں۔ خواتین یہاں زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہیں مگر ۔۔۔ کوئی انہیں نہیں گھورتا۔۔۔ کوئی انہیں نہیں تاڑتا۔۔۔ یہاں ہر مذہب ہر ملک کی عورت احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے خواہ وہ سارنگ (ملائیشیا کا قومی لباس) پہنے۔۔۔ سر پہ سکارف باندھے ہوئے ہو یا پھر۔۔۔ مِنی بلاؤز مِنی اسکرٹ میں ہو۔۔۔ کوئی انہیں کچھ نہیں کہتا کہ۔۔۔ یہ ملائیشیا ہے۔ یہاں لوگ سر اٹھا کر جیتے ہیں اور سیاح یہاں گام گام خوبصورتیاں سمیٹتے دکھائی دیتے ہیں۔

باتو کیوز سے نکل کے ہم کوہ اناس (Bukit Ananas) آ گئے تھے۔

کسی زمانے میں یہاں اناس کے باغات ہوا کرتے تھے۔ تاحدِ نگاہ اناس ہی دکھائی دیتے تھے بس۔۔۔ تب سے اسے کوہ اناس کہا جانے لگا۔ اناس بیچتی یہ لڑکیاں یہاں بھی حصولِ روزگار میں مگن تھیں جو۔۔۔ بڑی مہارت سے اناس چھیلنے کی بجائے اسے اوپر سے کاٹ رہی تھیں اور تیز دھار چاقو سے اناس کے گودے کے ٹکڑے کر کے، درخت کی لمبے کانٹے نما ٹہنی کو اس گودے میں لگا کے گاہکوں کو کھانے کے لیے دے رہی تھیں۔ سیاحوں پر جھپٹتی یہ لڑکیاں بڑی پھرتی سے۔۔۔ اناس کا گودا نکالتیں اور خریدار کو پیش کر دیتیں۔

اناس کا کاروبار تو یہاں اب بھی تھا مگر کوہ اناس نہیں کہ۔۔۔ اس کی جگہ اب ایک خوبصورت پارک نے لے لی تھی۔ جہاں سیاحوں کی گہما گہمی تھی ۔۔۔ برقی جھولے تھے۔۔۔ رنگا رنگ ثقافت تھی۔۔۔ کھانے پینے کی چیزیں تھیں اور اس کے باوجود یہ پارک

صاف ستھرا تھا کہ اس ملک کے باسی اپنے دیس کو۔۔۔۔اپنے دیس کی تفریح گاہوں کو صاف رکھنا جانتے ہیں۔

اس دیس کو یونہی ہرا بھرا اور شاداب دیکھنا چاہتے ہیں۔

کوالالمپور کی گیلی سڑکوں پر افضال کی پروٹون طیارہ دوڑتی جاتی تھی اور میں ۔۔۔۔ادھر ادھر پھیلے سبزے کی شادابی دیکھتی تھی جسے بارش کی کثرت نے نکھار دیا تھا۔ بادل کچھ یوں ٹوٹ کے برسے تھے جیسے۔۔۔۔اب تک اپنے نہ برسنے پہ نادم ہو رہے ہوں۔ اک اک پات دھو ڈالا تھا۔ یہ شبنمی تراوٹ جی سرشار کرتی تھی اور اس دیس کے شاداب ہونے کی گواہی دیتی تھی۔

ہم ٹیلوں۔۔۔۔میدانوں۔۔۔۔ڈھلوانوں سے گزرتے ہوئے اب موٹروے پہ آ گئے تھے جس کے دونوں طرف پام کے ہریاول دستے ایستادہ تھے اور سڑک کے بیچوں بیچ ۔۔۔۔وہ گرین بیلٹ تھی جو آتے جاتے راہروؤں۔۔۔۔کی توجہ کا مرکز بنتی تھی اور ستائش پاتی تھی۔

آگے اب پہاڑی رستہ تھا۔ ہم اس پہاڑی رستے پہ آگے بڑھتے جاتے تھے اور ۔۔۔۔اپنے پیارے پاکستان کی خوبصورتی کو یاد کرتے تھے۔۔۔۔اپنے رب کی فیاضیوں کا شکر ادا کرتے تھے جس نے۔۔۔۔ہمارے دیس کو بے پناہ حسن سے نوازا مگر۔۔۔۔

نہ حکمرانوں کو اسے سنبھالنے کا سلیقہ آیا اور نہ خود۔۔۔۔ہم لوگوں نے اسے نکھارنے، سنوارنے کی کوشش کی۔ ورنہ اگر ملائیشیا کی طرح ہمارے ہاں بھی خاطر خواہ سیاحتی اقدامات کئے جاتے تو یہ سیاحت ہی۔۔۔۔ہماری ملکی معیشت کو مضبوط سے مضبوط تر بنا دیتی۔

ملائیشیا کا سرکاری مذہب تو اسلام ہے مگر یہاں۔۔۔۔مذہبی اور شخصی آزادی ہر مذہب کے لیے ہے۔ مختلف مذاہب کے لوگ یہاں آزادانہ اپنی عبادات کی ادائیگی کرتے ہیں۔ اپنی

عبادت گاہیں تعمیر کرتے ہیں۔اس کا اندازہ مجھے یہاں رستے میں بہت سے مندروں کو دیکھ کر ہوا تھا۔یہ مندر ہمیں راہ میں روکتے تھے مگر ہم آگے۔۔۔اور آگے بڑھتے جاتے تھے کہ جی میں اب۔۔۔دور پہاڑوں کے دامن میں جانے کی خواہش مچلتی تھی جو رستے میں ہمیں کہیں رُکنے ہی نہ دیتی تھی لیکن ایک جگہ آخر ہمیں کچھ دیر رُکنا ہی پڑا کہ۔۔۔ہماری ننھی سی ٹورسٹ تعبیر اب کسمسانے لگی تھی۔

یہ کئی منزلہ بلند و بالا عمارت تھی جو پہاڑ کے ساتھ سر اٹھائے کھڑی تھی۔اس عمارت میں اندر داخل ہوئے تو سامنے۔۔۔ایک بڑا سا ہال تھا اور دائیں بائیں بہت سے کمرے جو یقیناً سیاحوں کے لئے تھے۔ارم تعبیر کو سنبھالنے میں لگ گئی اور میں۔۔۔اس عمارت کے ہال کی سامنے والی دیوار میں بنائے گئے دریچوں کی طرف بڑھ گئی۔

ان دریچوں سے دل ہولا دینے والی گہرائیاں دکھائی دیتی تھیں۔پہاڑوں کے جلو میں دور تک بل کھاتی سڑک کی دلفریبی۔۔۔جی لبھاتی تھی اور حسین پہاڑوں کے نظارے اپنی گرفت میں لیتے تھے اور۔۔۔کچھ دیر رکو۔۔۔کچھ دیر اور رکو۔۔۔کی ضد کرتے دکھائی دیتے تھے مگر۔۔۔وقت کی تسبیح کے دانے تھے کہ تیزی سے گرتے جاتے تھے۔اب تو دن ڈھلنے کو تھا۔سورج کی کرنیں پہاڑوں کو الوداعی بوسہ دے رہی تھیں اور ہمیں ابھی۔۔۔کچھ اور آگے جانا تھا۔گینتھنگ ہائی لینڈ پہنچنا تھا مگر اس ہل اسٹیشن کے رستے میں۔۔۔اس پہاڑ کے دامن میں ایک مندر نے پھر ہمیں روک لیا تھا۔

اس مندر کے باہر مہاتما بدھا کا بہت بڑا سا ایک مجسمہ آلتی پالتی مارے اپنے گیان میں گم تھا۔اس مندر کے صحن سے ایک رستہ بل کھاتا ہوا اوپر کو جاتا تھا اور اس رستے پہ پہاڑ میں ساتھ ساتھ جو محرابیں دکھائی دیتی تھیں ان میں۔۔۔بڑے بڑے قد آور بت ایستادہ کئے گئے تھے۔ارم اور افضال اوپر جا کے اس مندر کو دیکھنا چاہتے تھے مگر۔۔۔

میں جو باتو کیوز (Batu Caves) جا کے بھی ۔۔۔ وہاں کا سب سے بڑا مرکزی مندر دیکھے بنا ہی پلٹ آئی تھی۔ یہاں اوپر مزید چڑھائی چڑھ کے اس مندر کو دیکھنے کا قطعاً ارادہ نہ رکھتی تھی اس لئے ۔۔۔ جہاں تک نظر جا سکتی تھی اس مندر پر نظر ڈالی اور واپس آ گئی مگر ۔۔۔ یہاں تو گام گام اسی طرح کے شاہکار مندر دکھائی دیتے تھے۔ اپنی طرف بلاتے تھے لیکن ہم ان کی پکار پہ کان دھرے بنا ہی آگے بڑھ گئے تھے کہ ہر پکار کو لبیک کہنا ہمارے بس میں نہیں تھا۔

شام نے اپنا آنچل پھیلا دیا تھا۔ فلک کی چنری تاروں سے بھرنے لگی تھی۔ پہاڑ کے منظر سیاہ لبادہ اوڑھنے کی تیاری میں تھے۔ اس اندھیرے نے سڑک کے بل چھل بھی چھپا دیے تھے۔ بس دور دور ٹمٹماتے دیے آبادی کا پتہ دیتے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے بتا گئے تھے کہ ۔۔۔ ہماری منزل اب قریب ہے۔ کوالالمپور سے اس پہاڑی مقام تک آنے میں ہمیں تقریباً دو گھنٹے لگ گئے تھے۔ اندازاً پچاس ساٹھ کلومیٹر کی یہ مسافت پون گھنٹے میں طے ہوتی ہے مگر رستہ پہاڑی ہونے کی وجہ سے زیادہ وقت لگ گیا تھا اور رات اترتے ہی ہم اس خوبصورت پہاڑی مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں ۔۔۔ دنیا بھر کے مختلف ممالک سے آئے ہوئے لوگ اس حسین جگہ پہ موجود تھے۔

(Genting Highland) گینتھنگ ہائی لینڈ ایک پہاڑی گزرگاہ جو تقریباً ساڑھے پانچ ہزار فٹ کی اونچائی پہ ۔۔۔ ملائیشیا کی ریاستوں پاہانگ اور سیلنگور کے پہاڑوں پر واقع ہے۔ یہ ایک خوبصورت مقام ہے۔ جہاں پہاڑوں کی خموشی گنگناتی ہے اور زندگی اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ مسکراتی ہے۔

ہم یہ جولانیاں دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے وہاں ۔۔۔ اس طرف ۔۔۔ جہاں ہر رنگ کی تہذیب وثقافت اپنی جھلک دکھا رہی تھی اور جہاں ۔۔۔ رات اترنے کے بعد

بھی رات اتری نہیں تھی۔

رات یہاں اترتی بھی کیسے؟

کہ یہاں آنے والے تو لمحہ لمحہ رونقیں کشید کرتے ہیں۔ پل پل نظاروں کو اپنی آنکھوں میں بھرتے ہیں۔ اپنی اپنی دلچسپیاں تلاش کرتے ہیں اور۔۔۔۔زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں مگر تھکتے نہیں۔ میں بھی تو پورا دن سفر در سفر کرتی آئی تھی مگر وجود میں تھکن نہیں اتری تھی۔

❁

گینتھنگ ہائی لینڈز اور کیبل کار

فرسٹ ورلڈ ہوٹل گینتھنگ ہائی لینڈ کی کثیر المنزلہ عمارت ہے جس پہ بکھرے نیلے، پیلے اور سرخ رنگ دور سے ہی شوخیاں کرتے دکھائی دیتے تھے اور اس کے دو ٹاور۔۔۔ آسمان کی بلندیوں کو چھونے کی سعی کرتے نظر آتے تھے۔ اس عمارت کی پیشانی پہ جلی حروف میں جل بُجھ جل بُجھ کرتے فرسٹ ورلڈ پلازہ کے حروف۔۔۔ ہمیں اپنی طرف بلاتے تھے کہ یہیں ہمارا قیام تھا۔ اس شوخ نگری میں ہماری بکنگ آن لائن ہو چکی تھی۔ اس لئے استقبالیہ پر زیادہ دیر نہیں لگی۔ چھ ہزار سے زائد کمروں والے اس ہوٹل کے ٹاور I میں سولہویں فلور پہ ہمیں کمرہ ملا تھا۔

کمرہ کشادہ تھا اور تمام تر سہولتوں سے آراستہ بھی تھا۔ ہم جو سارا دن حالت سفر میں رہے تھے۔ کمرے میں پہنچتے ہی طمانیت محسوس کرنے لگے تھے۔ افضال فریش ہونے چلے گئے۔۔۔ ارم اپنی بچی کو سنبھالنے میں مصروف ہو گئی اور میں پہاڑ کی بلندیوں پہ بنے اس بلند ترین ہوٹل کے بلند ترین فلور کے کشادہ سے کمرے میں لگی بڑی سی کھڑکی کی طرف چلی آئی اور اپنی آنکھیں اس کھڑکی کے شیشوں سے لگا دیں۔

سامنے دور تک ۔۔۔۔ جہاں جہاں میری نظر جاتی تھی ۔۔۔ گہرائیوں میں ۔۔۔ اُترائیوں میں بسے گھروں میں ٹمٹماتے دیوں کی جھلملاہٹ مجھے۔۔۔ میرے بلندی پہ کھڑا ہونے کا یقین دلاتی تھی۔ ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے بادل۔۔۔ دیوانہ وار کھڑکی کے شیشوں

سے ٹکراتے تھے اور کمرے میں در آنے کی بے جا ضد لگاتے تھے۔ بارش کی رِکن مِن بادلوں کے سنگ کھڑکی کے شیشوں پہ جلترنگ بجاتی تھی اور شدت سے اپنے ہونے کا احساس دلاتی تھی تو -----

مجھے گماں گزرتا تھا جیسے یہ بارش ---- تیز دھوپ میں کوالالمپور کی تپتی ہوئی سرمئی سڑکوں پہ، ہمارے دن بھر کے جھیلے گئے حبس کی چُبھن کا ازالہ کرنے کے جتن کر رہی ہو اور پھر ---- کچھ ہی دیر بعد ہم اس رنگین فرسٹ ورلڈ ہوٹل کی رنگینیاں دیکھنے نیچے چلے آئے تھے۔

فرسٹ ورلڈ کی اس رنگین نگری میں ہزاروں کمرے تھے۔ بہت سے تھیم پارک تھے ---- آؤٹ ڈور ---- ان ڈور رائیڈز تھیں ---- سلائیڈر اور رولر کوسٹر اور جھولے تھے ---- کسینو اور شاپنگ سنٹر تھے ---- لوگوں کا میلہ تھا اور سیاحوں کا ریلا تھا۔ مسلم ---- غیر مسلم ---- ملکی اور غیر ملکی سب اس ہجوم بیکراں کا حصہ تھے۔ یہیں ایک طرف Believe it or not کی دنیا آباد تھی جہاں مصنوعی آسمان، چاند تارے وغیرہ بنائے گئے تھے مگر ہم نے اس Believe it or not کو صرف باہر سے دیکھنے پر ہی اکتفا کیا کہ یہاں ---- یقین اور بے یقینی کی کیفیت سے کیا گزرنا؟

عمر بھر یہی کیفیات تو ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔

بچوں نے سچ کہا تھا۔ گینتھنگ ہائی لینڈ کا حسن رات کو اپنے جوبن پر ہوتا ہے۔

یہاں رات کو بھی دن کا گماں ہو رہا تھا ---- رونقیں امڈی پڑی تھیں۔ آؤٹ ڈور پارک کے باہر تو جیسے میلہ لگا ہوا تھا۔ اس آؤٹ ڈور پارک میں داخل ہونے کے لئے پچاس رنگٹ کا بینڈ خریدنا پڑتا ہے۔ تب آپ پارک کی اس وسیع دنیا کی ساری رائیڈز استعمال کر سکتے ہیں۔ رولر کوسٹرز اور جھولوں کے مزے لے سکتے ہیں۔

مجھے تو ان میں سے کوئی رائیڈ لینا تھی نہ رولر کوسٹرز اور جھولے جھولنے تھے۔ مگر پھر بھی

پچاس رنگٹ کا یہ بینڈ میرے لئے لیا گیا کہ باہر۔۔۔۔اس اجنبی جگہ پہ میں اکیلی بھلا کیا کرتی؟

رونق تو باہر بھی بہت تھی مگر اندر تو روشنیوں کا سیلاب تھا۔۔۔۔رنگوں کی برسات تھی ۔۔۔۔الیکٹرک جھولوں کا شور تھا۔۔۔۔رولر کوسٹرز کا خوف تھا کہ۔۔۔ان رولر کوسٹرز کی گھمیریاں اپنے سواروں کی دلدوز چیخیں نکلوا رہی تھیں اور مجھے بھی ڈرا رہی تھیں حالانکہ میں تو تعبیر کو گود میں دُبکائے ان حیرت کدوں کو صرف دیکھ رہی تھی۔

وقت، وقت کی بات ہے۔کبھی جھولے مجھے بہت پسند تھے۔جھولے پسند تو اب بھی ہیں مگر۔۔۔ایسے خطرناک اور خوفناک نہیں۔

ہمارے بچپن میں تو جھولے ہی واحد تفریح ہوا کرتے تھے۔اوکاڑہ کے کمپنی باغ اور ساہیوال کے پرتاب باغ میں جب عید کے دنوں میں خواتین عید میلہ لگتا تو۔۔۔ہم ساری کزنز اپنی ساری عیدی ان آسمانی جھولوں کی نذر کر دیا کرتی تھیں۔تب درختوں پہ پڑے جھولوں سے آسمانی جھولوں تک کا یہ سفر بڑا دلفریب لگتا تھا اور اب۔۔۔۔ان طوفانی جھولوں کو میں نے دُزدیدہ نگاہوں سے صرف دیکھنے پر ہی اکتفا کیا جبکہ۔۔۔بچے جھولوں کی اس نگری میں کہیں گم ہو گئے تھے یا شاید اپنے اپنے بینڈ سے بھرپور فائدہ اٹھانے میں لگے تھے۔

آؤٹ ڈور پارک سے نکلے تو ہم کے ایف سی (KFC) چلے آئے۔یہاں مختلف ممالک۔۔۔مختلف بین الاقوامی برانڈز کے ریسٹورنٹ موجود تھے مگر میرے میزبانوں کو یہی بھا گیا تھا اور میں بھی اب کھانے میں "جو مل جائے" کے فارمولے پر عمل کرنے لگی تھی کہ ۔۔۔بچپن کی من مانیوں اور پسند ناپسند کی ضدوں کا دور گزرے بھی اک زمانہ بیت گیا تھا۔ ویسے یہ بڑے بڑے برانڈ بھی خوب ہیں۔کسی ملک میں چلے جاؤ یہ اپنی باہیں وا کیے ہوئے ملتے ہیں۔اس وقت کے ایف سی میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی کہ یہاں رات جاگ رہی تھی ۔۔۔۔ بلکہ اب تو اور بھی زور شور سے جاگنے لگی تھی۔درجہ حرارت خاصا کم تھا مگر۔۔۔۔لوگوں کی گرم

جوشی اس نقطۂ انجماد کو نظر انداز کرنے پہ تلی تھی۔ بھیگی بھیگی یخ بستہ رُت میں ہم نے رات اترتے تو دیکھی مگر۔۔۔۔ رات گزرنے کے آثار نہیں دیکھ سکے کہ لوگ حسین نظاروں کو۔۔۔ بادلوں کی اٹھکیلیوں کو۔۔۔ بارش کی کن من کو دیکھ دیکھ کر سرشار ہورہے تھے۔ یہاں گینتھنگ کی سحر انگیز فضا میں رنگارنگ ثقافت دکھائی دیتی تھی۔

یہ گینتھنگ بھی۔۔۔ کبھی ایک پہاڑی گاؤں ہوا کرتا تھا اور اب یہاں ٹورسٹوں کے میلے لگے ہیں۔ میں نے سوچا!

حسن تو میرے پاکستان میں بھی کم نہیں۔ ربِ کریم نے میرے دیس کو بھی بھرپور خزانوں سے نواز رکھا ہے مگر۔۔۔۔ اسے مہاتیر جیسا کوئی حکمران نہیں ملا۔ اسے سنوارنے والا اسے نکھارنے، سنبھالنے والا کوئی لیڈر نصیب نہیں ہوا۔ پاکستان کی آزادی کے دس برس بعد آزادی حاصل کرنے والے اس ملک کے لیڈر اسے دنیا بھر میں ممتاز کر گئے۔۔۔ اسے نمبرون بنا گئے۔ میں اس ملک میں جہاں بھی گئی۔ میں نے تفریحی مقامات۔۔۔ تاریخی مقامات۔۔۔ بازاروں۔۔۔ ساحلوں غرضیکہ ہر جگہ۔۔۔۔ سلام، ستو ملائیشیا (Salam Satu Malaysia) یعنی ملائیشیا نمبرون کا سلوگن دیکھا اور۔۔۔ حقیقت میں بھی اسے نمبر ون ہی پایا۔ دراصل اسے نمبرون بنانے میں صرف یہاں کے حکمران ہی نہیں عوام بھی برابر کے شریک تھے۔ اونچی نیچی آبادی والے اس ٹیڑھے میڑھے ملک میں حکمرانوں نے اگر ترقیاتی کام کیئے تو۔۔۔ اس کے باسیوں نے بھی ملک کو خوب جی جان سے سنوارا۔ قدم قدم بکھری خوبصورتیوں کی حفاظت کی۔۔۔ نیک نیت حکمرانوں نے سیاحت سے اس ملک کی معیشت کو بڑھایا اور خوب پیسہ کمایا مگر۔۔۔ یہ پیسہ کما کے ہمارے حکمرانوں کی طرح انہوں نے غیر ممالک میں اپنی جائیدادیں نہیں بنائیں۔۔۔ بینک بیلنس نہیں بڑھائے بلکہ یہ پیسہ انہوں نے ۔۔۔ اس ملک کو مزید نکھارنے سنوارنے میں لگا دیا۔۔۔ ملک کی سیاحت کو فروغ دینے

میں لگا دیا اور دنیا بھر میں ملائیشیا کو نمبر ون بنا دیا۔

گینتھنگ کی رونقیں اپنے سحر سے نکلنے ہی نہ دیتی تھیں مگر۔۔۔۔۔ہم ان سے نظریں چرائے، باسکن اینڈ رابنز (Baskin & Robbins) کے مزے لیتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے آئے کہ صبح کیبل کار تک رسائی حاصل کرنا تھی اور۔۔۔۔دوپہر بارہ بجے تک ہمیں فرسٹ ورلڈ ہوٹل کی ان رونقوں کو۔۔۔۔ان بلندیوں کو بھی الوداع کہنا تھا جہاں۔۔۔۔۔ہمارا قیام تھا۔

فرسٹ ورلڈ ہوٹل میں ناشتہ کمپلیمنٹری تھا۔ ناشتے کے مقررہ وقت پر ہم پہنچے تو یہاں ۔۔۔۔ویسی ہی چہل پہل تھی جیسی ہم رات کو دیکھ چکے تھے۔ گمان گزرتا تھا بہت سے لوگ تو یہاں آنکھ جھپکنے کے روادار بھی نہ ہوئے تھے۔ لوگوں کی آرجار لگی ہوئی تھی۔ مختلف ڈشز اور مختلف اقسام پہ مشتمل ناشتہ یہاں موجود تھا۔ اعلیٰ کوالٹی کے پھل تھے۔۔۔۔ بیکری آئٹمز تھے ۔۔۔۔تازہ جوس تھے۔ کافی، چائے، ٹائے پناس سبھی کچھ تھا یہاں۔ ناشتہ ہم نے بہت اطمینان سے کیا۔ کچھ دیر اس رونق کو دیکھا اور پھر چلے آئے کہ تیار ہونا تھا۔۔۔۔سامان سمیٹنا تھا اور پھر اس رنگین نگری کو۔۔۔۔الوداع بھی کہنا تھا۔

تیار ہو کر میں ایک بار پھر اسی کھڑکی سے آ لگی جس نے۔۔۔۔یہاں آتے ہی مجھے اپنا اسیر کر لیا تھا۔ پہاڑوں پہ دور تک ہلکی ہلکی دھوپ کی چاندی بکھری ہوئی تھی۔ بادلوں میں لپٹی ہوئی۔۔۔۔بارش میں بھیگی ہوئی۔

تو یہ نظارے اب پرائے ہونے کو ہیں۔ میں نے جی میں کہا۔۔۔۔انہیں آنکھوں میں بھر لوں۔۔۔۔۔یہ نظارے جی بھر کے دیکھ لوں اور پھر چل دوں۔ بچے تیار تھے ہم نے سامان سمیٹا اور فرسٹ ورلڈ ہوٹل کی اس رنگین بستی سے نکل آئے۔

کیبل کار تک پہنچے تو اندرون اور بیرون ملک سے آئے لوگوں کے ہجوم نے ہمارے

ہوش اڑا دیے۔ مجھے تو یہی گمان ہوا کہ جیسے کیبل کار کا سفر اب ناممکنات میں ہے مگر۔۔۔۔ میرے داماد ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں۔ سو وہ اس منظم ہجوم میں شامل ہو گئے۔ کیبل کاروں کا سفر جاری و ساری تھا۔ اک آ رہی تھی۔۔۔۔ اک جا رہی تھی۔ برقی لہروں پہ ڈولتی یہ کیبل کاریں عقابوں کی مانند دکھائی دیتی تھیں۔

وقفے وقفے سے یہ کیبل کاریں آتیں، پل بھر کو رکتیں، جھپٹا مار کے اپنے سواروں کو گود میں بھرتیں اور۔۔۔۔ ہوا میں تیرنے لگتیں۔ میں اُن کی یہ آنیاں جانیاں دیکھ رہی تھی کہ افضال نے کیبل کار تک رسائی کی نوید سنا دی۔ ہم تیزی سے اپنی سواری کی طرف بڑھے۔ اس کیبل کار میں ہم کُل چھ لوگ تھے۔ ایک انگریز جوڑا۔۔۔۔ درمیانی عمر کا۔۔۔۔ ایک افریقی نوجوان اور ہم تین۔ جونہی ہم نے نشستیں سنبھالیں۔ ہماری تصاویر لے لی گئیں۔ تصاویر لینے کے اس انداز لمحہ بھر کو دل اندیشوں میں ڈوبا۔ میں نے شیشے کے بند ڈبے سے تا کا جھانکی کی کوشش کی مگر کیبل کار کے ہلکوروں نے کچھ دیکھنے ہی نہ دیا۔ پھر دھیرے دھیرے اس نے اڑان تیز کر دی اور خوبصورت پہاڑی ڈھلوانوں کے درمیان برقی تار پہ ڈورنے لگی۔ میں نے دیکھا نیچے اس قدر گھنا جنگل کہ زمین چھپ گئی تھی۔ کیبل کار سبزہ زاروں۔۔۔۔ اتھاہ گہرائیوں پر سے گزر رہی تھی۔ میں جونہی کن اکھیوں سے نیچے نظر ڈالتی تھی تو بدن میں سنسنی سی ڈورنے لگتی تھی۔ وہ انگریز جوڑا ہر زاویے سے تصویریں بنانے میں مگن تھا۔ بڑے جوش ولولے اور محویت سے بچے بھی قدرت کی صناعیاں اور انسانی ذہن اور ہاتھوں کی اختراعیاں دیکھ رہے تھے مگر۔۔۔۔

ایک میں تھی کہ جتنا شوق لئے۔۔۔۔ اس کیبل کار میں بیٹھی تھی اس سے کئی گُنا زیادہ خوف۔۔۔۔ اب دل میں بسائے ہوئے تھی۔ چند منٹوں کا سفر صدیوں جیسا لگنے لگا تھا۔

یہ زندگی بھی کیا چیز ہے؟ میں نے سوچا

شوق اور خوف کے بیچ سینڈوچ بنی رہتی ہے اور یہ انسان۔۔۔۔ گوشت پوست کا بنا

یہ انسان بادلوں کا سینہ چیر دیتا ہے۔۔۔۔پہاڑوں پہ بستیاں بسا لیتا ہے مگر یہی جی دار انسان جب کبھی۔۔۔کسی انجانے خوف کی زد میں آجاتا ہے تو پھر شوق۔۔۔دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔

جانے کتنے برسوں بعد میں کیبل کار کا سفر کر رہی تھی۔تب اور اب میں واضح فرق سامنے آگیا تھا۔کم عمری آپ سے بڑے بڑے کام کرا جاتی ہے کہ جب۔۔۔جذبے اور ہمت جواں ہوتی ہے جب کہ ڈھلتی عمر میں شوق۔۔۔تو نوجوان رہتے ہیں مگر ہمت کم ہونے لگتی ہے۔

تو یہ خوف ڈھلتی عمر کا شاخسانہ ٹھہرا۔میں نے دل کو تسلی دی۔

خود کو شیشے کے ایک چھوٹے سے بند ڈبے میں ہوا میں ڈولتا ہوا دیکھ کے جی میں جو اندیشے سر اٹھا رہے تھے وہ ختم ہوئے کہ۔۔۔کیبل کار بحفاظت ہمیں واپس وہاں اتار کے چلتی بنی تھی۔جہاں اتنی بلندیوں سے آنے والے حواس باختہ لوگوں کو ڈیوٹی پر موجود گارڈ۔۔۔سنبھالا دے رہے تھے کہ۔۔۔۔

بلندی سے نیچے آنے والوں کو سنبھلنا ہی پڑتا ہے۔

ارم اور افضال بھی مجھے یوں گم صم دیکھ کے تھوڑا گھبرا گئے تھے اور میں۔۔۔کچھ نادم سی خود کو حواسوں میں لانے کی کوشش کر رہی تھی مگر۔۔۔دنیا کے سات عجوبوں کی بڑی بڑی پتھر سے بنی نصب مورتیاں بھی مجھے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی تھیں۔جی ایک دم ہی اُچاٹ سا ہو گیا تھا۔طبیعت بحال کرنے کو افضال نے گینتھنگ کی مشہور ذائقہ چائے کا سہارا لیا جو مختلف ذائقوں ،مختلف رنگوں اور مختلف درجہ حرارت میں دستیاب تھی۔افضال کا خیال تھا کہ (Ice Tea) لی جائے مگر مجھے تو گرم چائے ہی اچھی لگتی ہے۔ہمارے ابا جان چائے کے بارے میں کیا کرتے تھے کہ۔۔۔۔

چائے لب سوز ہو،لب دوز ہو،لب ریز ہو اور لب بستہ ہو،تب ہی مزا دیتی ہے۔بچوں

نے لیمن ٹی ود آئس لی تھی۔اس چائے نے قدرے کام دکھایا۔طبیعت ہشاش بشاش ہوگئی۔ یہاں جگہ جگہ جانوروں کے مجسمے تھے۔۔۔نوادرات تھے مگر اب ہم ان سب سے آنکھیں چرا کے گاڑی میں جا بیٹھے تھے۔گینتھنگ ہائی لینڈ اب ہم سے چھوٹنے کو تھا۔واپسی پہ جن مندروں کو دیکھنے کا ارادہ کر کے ہم آگے بڑھ گئے تھے انہیں۔۔۔دیکھنے کا خیال بھی دل سے نکال دیا تھا کہ وقت ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا اور۔۔۔ہمیں پہلے کوالالمپور اور پھر سٹیٹ پیراک جانا تھا ۔۔۔اترائی کا سفر نسبتاً آسان ہوتا ہے سو ہم جلد ہی کوالالمپور پہنچ گئے تھے۔

یہاں سڑک کنارے کھڑی لڑکیاں لہسن کی شکل کا ایک پھل بیچ رہی تھیں۔میں نے تو یہ پھل کبھی دیکھا تھا اور نہ کھایا تھا مگر افضال کے تجربے ہمیں نئے ذائقوں سے آشنا کروا رہے تھے۔انتہائی شیریں تُریاں تھیں اس پھل کی۔اس کے ساتھ ہی ایک کانٹے دار پھل بھی تھا مگر کسیلا ۔۔۔کسیلا سا ذائقہ لئے ہوئے دُریان نامی یہ پھل۔۔۔سنا ہے کہ پک جانے پہ بھی اپنا ٹھکانہ نہیں بدلتا وہیں اسی شاخ پہ لٹکا رہتا ہے۔میں جی ہی جی میں اس دریان کی وفاداری کو سراہنے لگی اور۔۔۔افضال کی پروٹون طیارہ تیزی سے واپسی کا طے کرتی رہی۔تبھی تو شام ڈھلنے سے ذرا پہلے یہ ہمیں منزل پہ لے آئی تھی۔

❁

سلطان اذلان شاہ کا شہر

گزشتہ تین دن ہم نے کوالالمپور کی پر رونق سڑکوں پہ بھاگتے دوڑتے گزار دیے تھے اس وقت تو سیر و تفریح کے شوق نے تھکاوٹ کو پاس نہیں آنے دیا تھا مگر۔۔۔گھر پہنچتے ہی تھکن یوں پور پور میں اتری تھی کہ دن چڑھ آیا تھا اور آنکھ نہیں کھلی تھی۔

یہ آنکھ شاید ابھی کچھ دیر اور نہ کھلتی اگر۔۔۔کوئی دروازے کی گھنٹی پہ اپنی انگلی رکھ کے نہ بھول جاتا۔ مسلسل بجتی یہ گھنٹی نیند میں رخنہ ڈال گئی تھی۔ میں نے کروٹ بدلتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی۔ گیارہ بجنے والے تھے۔

اف اتنی نیند! میں گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔

کون آ گیا اس وقت؟ میں قیاس آرائی کرنے لگی۔ کچرے والا تو گھنٹی نہیں بجاتا کہ یہاں سب لوگ کچرا گھر کے پچھلے دروازے پہ رکھ دیتے ہیں جہاں سے بلدیہ کی گاڑی وقت مقررہ پہ اٹھا کر لے جاتی ہے اور پھر یہ اپنا دیس بھی نہیں کہ جہاں جب جی چاہے۔۔۔کوئی ملنے چلا آئے۔۔۔جدید سہولتوں کے ہوتے ہوئے بھی اچانک پہنچ کے مکینوں کو حیران کر دے اور اگر مکین گھر میں نہ ملیں تو۔۔۔ڈھیروں ڈھیر شکوے کر ڈالے۔ یہ تو پردیس ہے بھئی! جہاں چند ہم وطن کلاس فیلو ہیں اور چند ایک ملنے والے بھی بغیر اطلاع کئے کبھی نہیں آتے۔ میں خود کلامی کرتے ہوئے اپنے کمرے سے نکلی تب تک ارم آنے والوں کو لاؤنج میں لے آئی تھی۔ میری آنکھوں میں ابھرے سوال دیکھ کے بولی!

یہ محکمہ صحت کے نمائندے ہیں۔ تعبیر کے ماہانہ چیک اپ کے لئے آئے ہیں۔ اس ملک کا ذمہ دار عملہ مجھے خوشگوار حیرت دے گیا۔ ملائی خاتون نے اشاروں کنایوں میں ارم سے کچھ کہا۔ ارم اندر گئی اور تعبیر کا ہیلتھ کارڈ لے آئی اور ساتھ ہی پائن ایپل جوس بھی۔ نرس نے بچی کا وزن کیا۔۔۔۔ ٹمپریچر دیکھا۔۔۔۔ مرد نے اپنے رجسٹر میں اندراج کیا۔۔۔۔ ویکسینیشن کی یاد دہانی کرائی۔۔۔۔ جوس پیا اور چلتے بنے۔

میں انہیں دیکھتی ہی رہ گئی۔ نہ ارم نے ان کی مٹھی گرم کی اور نہ۔۔۔۔ انہوں نے بخشش طلب نگاہوں سے ارم کو دیکھا۔ میں نے اس ملک کے نظام صحت کو سراہا۔۔۔۔ فرض شناس عملے کو خراجِ تحسین پیش کیا جو ڈیوٹی کو بوجھ نہیں فرض سمجھ کے ادا کر رہے تھے یہاں بچہ کسی بھی ہسپتال میں پیدا ہوا ہو وہاں سے اس کے رہائشی ایڈریس کے مطابق بچے کا سارا ریکارڈ۔۔۔۔ اس علاقے کے ہیلتھ سنٹر میں بھیج دیا جاتا ہے۔ بچہ ملکی ہو یا غیر ملکی۔ یہ ہیلتھ سنٹر اس بچے کی صحت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کا ماہانہ چیک اپ اور ویکسینیشن اس ہیلتھ سنٹر کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ صحت مند معاشرہ۔۔۔۔ صحت مند عوام، ترقی یافتہ قوموں کی پہچان ہے اور ملائیشیا تعلیم اور صحت کے معاملے میں اپنی پہچان بنا چکا ہے۔

افضال یونیورسٹی سے ایک نئے پلان کے ساتھ آئے تھے۔ کھانا کھاتے ہی ہم اونچی نیچی ڈھلوانوں والے ایک تاریخی شہر کی طرف چل دیے جو ٹرونو مائنز سے پندرہ کلومیٹر کی مسافت پہ تھا۔ بچوں نے کچھ خریداری کرنی تھی اور مجھے اس تاریخی شہر کی سیر کرانی تھی جو کبھی کنتا ڈسٹرکٹ کا دارالخلافہ ہوا کرتا تھا۔ ملائیشیا کی آزادی سے پہلے یہ علاقہ ٹن کے ذخائر سے مالا مال تھا اور برطانوی حکمرانوں، چینی مہاجروں اور ربڑ کے کاشتکاروں کے لئے یہ انمول جگہ تھی۔

یہ ٹاؤن کافی پرانا ہے۔

ایپوہ سے شمال کی طرف بیس کلومیٹر کی دوری پر اس قدیم ٹاؤن کی کچھ آبادی دریائے

کنتا کی قدم بوسی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ لہراتا ہوا، بل کھاتا ہوا، دریائے کنتا سبک خرامی سے یہاں اپنی چال چلتا ہے۔ دور سے دیکھو تو اس چھوٹے سے دریا کے بیچ دو ہاتھی ایک دوجے سے بغل گیر دکھائی دیتے ہیں لیکن جب۔۔۔۔ ان کے قریب جاؤ تو یہ پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ بہت بڑی جسامت کے دو گول پتھروں پہ ہاتھی کی شبیہہ قدرتی ہے یا خود ساختہ یہ خبر نہیں مگر ۔۔۔۔ پتھر کے یہ ہاتھی ہم پہ حیرت کے در ضرور کھول گئے تھے۔ پتھر کے ان ہاتھیوں کی نسبت سے یہ شہر باتو گاجا ہوا کہ۔۔۔۔ ملایا بھاشا میں باتو پتھر اور گاجا ہاتھی کو کہتے ہیں۔ پتھر کے یہ ہاتھی۔۔۔۔ قدرت کی صناعی کا نمونہ تھے یا انسانی ہاتھوں کا کرشمہ، وہ اس شہر کو اپنے نام سے منسوب کئے ہوئے تھے۔

باتو گاجا میں داخل ہوتے ہی باتو جاگا ہیریٹیج ٹرائل (BATU GAJAH HERITAGE TRAIL) کا بڑا سا بورڈ اس شہر کی اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔ اس بل بورڈ پہ یہاں کے تاریخی ورثے کی پوری تفصیل درج تھی۔ یہاں مندر۔۔۔۔ مسجد اور گوروارے بتا رہے تھے کہ ملائیشیائی تہذیب تین حصوں پہ مشتمل ہے۔ یہاں چینی، بھارتی اور دیگر قومیں بھی آباد ہیں۔ آبادی میں ملائیشین پچاس فیصد ہیں لیکن ۔۔۔۔ اقتصادیات میں ان کا کنٹرول صرف اُنیس فیصد حصے پر ہے۔ چینی ملائیشیا کی آبادی کا چوبیس فیصد ہیں لیکن اقتصادیات پر ان کا کنٹرول چالیس فیصد کے قریب ہے۔ ملائیشیا کی حکومت نے اقتصادی پالیسی کی یہ تقسیم 1971ء میں کی۔ ملک میں تعلیم، بزنس اور ملازمت میں ملائیشیائی باشندوں کو ترجیح دی لیکن پالیسی کے کنٹرول میں ۔۔۔۔ چینی باشندوں کو شامل کیا اور یہ فیصلہ ملک کی اکثریت کو اعتماد میں لے کر کیا گیا۔

افضال نے گاڑی خوبصورت بنگلوں کے سامنے روک دی تھی۔ سورج کا تاریخی گولہ آگ برسا رہا تھا اور اس آگ کی روشنی سے ٹن کی چھتوں والے یہ بنگلے لش لش کر رہے تھے۔

قدیم لکڑی کے بنے یہ دو خوبصورت بنگلے برطانوی دور میں اسٹیشن ماسٹر اور اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کی رہائش گاہ ہوا کرتے تھے۔ یہاں اب ریلوے سٹاف ہیڈ کوارٹر بنا دیا گیا تھا۔ لکڑی اور ٹن کا امتزاج میں پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

یہیں سڑک کے دوسری طرف پرانا ریلوے اسٹیشن تھا جو۔۔۔ فرنگی دور میں بنا اور 2007ء تک زیر استعمال رہا لیکن جب باتو گاجا سے ایپوہ تک ریلوے لائن بچھائی گئی اور نیا ریلوے اسٹیشن بنا دیا گیا تو پرانا ریلوے اسٹیشن میوزیم کا روپ دھار گیا۔ میوزیم دیکھنے کا وقت ہی کب تھا ہمارے پاس؟ ہمیں تو ابھی اس شہر میں کچھ اور گھومنا تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کبھی یہ علاقہ بہت خطرناک ہوا کرتا تھا لیکن فرنگیوں نے اس شہر کو اپنی حکمت عملی سے سنوارا۔ نکاسئ آب کا بہترین انتظام کیا۔۔۔ بلدیاتی نظام قائم کیا۔۔۔ جنگلات صاف کرائے۔۔۔ لینڈ سکیپنگ کی، اسکول، ہسپتال، عدالتیں، جیل اور کلب بنائے انہوں نے اپنی اور یہاں کے سلطانوں کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے باتو گاجا کو ترقی دی اور 1884ء میں اسے کنتا ڈسٹرکٹ کا دارالخلافہ بنا دیا۔ برطانوی ایڈمنسٹریشن نے اسے ایڈمنسٹریٹو ہیڈ کوارٹر بنا دیا۔ ربڑ کے کاشت کاروں نے ربڑ کی کاشت میں روز افزوں اضافہ کیا۔۔۔ ٹن کے ذخائر اور چینی کان کنوں کی محنت نے یہاں سرمایہ کاری کو بڑھاوا دیا تو دریا کنارے۔۔۔ ایک بستی آباد ہوگئی۔ چینیوں کے غول کے غول یہاں آ بسے اور یہ ٹاؤن ایک مالدار شہر بن کے ابھرا۔

جب یہ شہر غیر آباد تھا تو۔۔۔ کان کنوں اور کاشتکاروں نے یہاں جنگل میں منگل کر رکھا تھا۔ دریا کی قربت نے ٹن کی غیر قانونی سپلائی کے رستے آسان بنا رکھے تھے لیکن ان کاشتکاروں میں ایک ۔کے۔ ملائی پرمل پی لے (K. MALAI PERUMAL PILLEY) بھی تھا جو۔۔۔ اس ٹاؤن میں ربڑ کے کاشت کار کی حیثیت سے آیا اور ایک

کامیاب ٹھیکیدار کے طور پر تاریخ میں اپنا نام رقم کر گیا۔ باتو گاجا کی بہت سی تاریخی عمارتیں اس ملائی پر مل پی لے کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس نے یہاں بہت سی زمین خریدی، ربڑ کی کاشت نے اسے سہارا دیا اور ٹھیکیداری نے اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ملائی پر مل پی لے تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ وہ اپنی اس کمی پہ بہت رنجیدہ تھا۔ اپنی اس کمی کو اس نے۔۔۔۔ اس شہر میں تعلیم کو فروغ دے پورا کیا۔ اپنے گھر میں سکول کھولا۔ اپنے پڑوسیوں کے گھروں میں جا کر بچوں کے والدین کو بچے سکول بھیجنے پہ راضی کیا۔ استادوں کو تنخواہیں اپنی جیب سے دیں اور آخر۔۔۔۔ وہ ایک برٹش سکول تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ملبے میں دبے اس سکول کی باقیات کو نکالا اور ازسرِ نو تعمیر کی۔ پہلے اس کا نام برٹش انگلش سکول تھا۔ بعد میں اس وقت کے سلطان کے نام پر اس کا نام سلطان یوسف سکول رکھ دیا گیا۔ اپنے دور کا یہ ایک بہترین سکول مانا گیا۔ اس سکول میں بہت سے نامور لوگوں نے تعلیم حاصل کی۔ سلطان ازلان شاہ بھی اس سکول کے سابق طالب علموں میں سے ہیں۔

وہی سلطان ازلان شاہ جنہیں دنیا فادر آف ملائیشین ہاکی (Father of the Malaysian Hockey) کے نام سے جانتی ہے اور جو۔۔۔۔ سٹیٹ پیراک کے چونتیسویں سلطان بنائے گئے تھے۔

سلطان ازلان محب الدین شاہ ابن المرحوم سلطان یوسف عز الدین شاہ غفر اللہ 1928ء میں پیدا ہوئے۔ 1939ء سے 1949ء تک انہوں نے اسی سکول سے تعلیم حاصل کی اور پھر یونائیٹڈ کنگ ڈم (UK) میں وکالت کرنے کیلئے چلے گئے۔ وکالت کی ڈگری لے کر ملائیشیا واپس آئے۔ کچھ عرصے پریکٹس کے بعد جج بنا دیے گئے۔ 1965ء میں وہ ملائیشیا ہائی کورٹ کے جج بنے اور 1982ء میں لارڈ پریذیڈنٹ آف فیڈرل کورٹ مقرر ہوئے۔ 1984ء میں اپنے چچا کی وفات کے بعد تختِ پیراک کے وارث قرار پائے۔ سلطان ازلان شاہ بچپن ہی

سے ہاکی کے دلدادہ تھے۔ 1983ء میں انہوں نے اذلان شاہ ہاکی ٹورنامنٹ کا آغاز کیا اور تب سے اب تک۔۔۔۔ ہر سال ہاکی ٹورنامنٹ ہوتے ہیں اور سلطان اذلان شاہ اس کی سرپرستی کرتے ہیں۔

میری آنکھوں کے سامنے ٹی وی پر دیکھے گئے ایک ہاکی ٹورنامنٹ کی جھلکیاں آگئیں۔ سلطان اذلان شاہ میچ دیکھنے سٹیڈیم میں داخل ہوتے ہیں تو بغیر کسی پروٹوکول کے آتے ہیں۔ نہ حفاظتی گاڑیوں کا گھیرا اور نہ محافظوں کی فوج کا حصار ہوتا ہے اور جب ملائیشین ٹیم میدان میں اترتی ہے تو سلطان اذلان شاہ بڑی تمکنت کے ساتھ۔۔۔۔ ہاتھ لہرا کے اپنی ٹیم کا حوصلہ بڑھاتے ہیں اور پھر ٹورنامنٹ کے اختتام پر سلطان اذلان محب الدین شاہ اپنے ایکڑوں پر پھیلے ہوئے محل میں جب ٹورنامنٹ میں شریک تمام ٹیموں کو الوداعیہ دیتے ہیں تو۔۔۔۔ انہیں شاہی مہمان گردانتے ہوئے پذیرائی کرتے ہیں۔ تمام ٹیموں کے قومی ترانے سنائے جاتے ہیں اور تقریب کے اختتام پر سلطان اپنے معزز مہمانوں کو اعزازی شیلڈ دے کر رخصت کرتے ہیں۔

باتو گاجا کی سیر کرتے ہوئے ملگجا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اس ملگجے اندھیرے ہی میں ہم نے اس شہر کا وہ قید خانہ بھی دیکھ لیا جو۔۔۔۔ تعمیر تو 1888ء میں ہوا مگر اس کے گرد چار دیواری 1894ء تک نہ بن سکی تھی۔ قیدی دن بھر باتو گاجا کے جنگلات کی صفائی کرتے اور رات کو چھوٹے چھوٹے سیلوں میں بند کر دیے جاتے۔

ٹاؤن کے لحاظ سے یہ بہت بڑی جیل ہے۔ جس میں ہزاروں قیدی ایک ہی وقت میں رکھے جا سکتے ہیں۔ اسی قید خانے کی دیوار کی چھاؤں میں ایک پرسکون سا گھر بھی ہے۔ جس پہ سلطان یوسف عزالدین کے نام کی تختی اب بھی آویزاں ہے۔ یہ سلطان اذلان شاہ کے بچپن کا گھر ہے۔

برطانوی دور کی دلکش عمارتیں دکھاتے ہوئے اس شہر کی گلیوں میں گھماتے ہوئے

۔۔۔۔ہمیں مندر، مسجد دکھاتے ہوئے افضال اب ہمیں ٹی، ایف مارکیٹ لے آئے تھے۔

ٹی، ایف مارکیٹ میں وہ سب کچھ تھا جو ہمارے لاہور کے بڑے بڑے مالز میں ہوتا ہے۔ مجھے یہاں چیزوں کا معیار قدرے بہتر اور قیمتوں کا تناسب خاصہ کم لگا۔ یہاں بھی ہر کاؤنٹر پہ لڑکیاں براجمان تھیں۔ ہر سٹال پہ لڑکیاں موجود تھیں یہاں تک کہ۔۔۔۔سامان کی ٹرالی کو گاہکوں کی گاڑیوں تک پہنچانے کی ڈیوٹی بھی لڑکیاں ہی سنبھالے ہوئے تھیں۔ بچے اپنی خریداری میں مشغول تھے۔ میں پھلوں اور سبزیوں والے پورشن میں چلی آئی۔ جہاں پھل اور سبزیاں اتنی صاف ستھری اور تازہ دکھائی دیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی خرید لینے کا ارادہ ہو گیا۔ میں نے پائن ایپل خرید لئے کہ تازہ پائن ایپل کا اپنا ہی مزا ہے۔ افضال کو کریلے پسند ہیں۔ میں نے ایک ہی سائز کے تروتازہ کریلے بھی لے لئے کہ قیمہ بھرے کریلے بنا کر کھلاؤں گی۔ ارم اور افضال بھی اپنی ضرورت کی چیزیں لے چکے تھے۔ بچوں کے ساتھ میں بہت دیر اس مارکیٹ میں گھومتی رہی۔ لوگوں کے ہجوم کو آتے جاتے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ۔۔۔۔ڈیڑھ صدی قبل کا یہ غیر آباد علاقہ اب جدید شہروں میں شمار ہونے لگا ہے۔ اب یہ خطرناک نہیں رہا۔ اب تو یہ تاب ناک ہو گیا ہے۔

باتو گاجا کو الوداع کہہ کے نکلے تو افضال ٹرونو مائنز کے قریب تامل مسلم رحمت کے ریسٹورنٹ پر لے آئے۔ یہ اوپن ائر ریسٹورنٹ تھا۔ ہمارے کریڈوز کی طرز کا جس میں ۔۔۔۔دور تک کرسیاں لگی تھیں اور ان کرسیوں پہ ہر عمر کے لوگ براجمان تھے۔ یہ سب سامنے لگی بڑی سی ایل سی ڈی پہ ملایا کی فلم دیکھ رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا اور کوئی 100 PLUS سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کہیں کھانے کا دور چل رہا تھا اور کہیں صرف باتیں ہو رہی تھیں ۔میں نے دیکھا! یہاں اس وقت نوجوانوں سے زیادہ تعداد عمر رسیدہ لوگوں کی تھی۔ جو عمر ڈھلتے ہی خود پہ بیماری طاری کرنے اور گھر میں بہو بیٹیوں سے جھگڑنے کی بجائے تیزی سے بھاگتی

زندگی میں سے خوشیوں کے لمحے چننے کو یہاں موجود تھے۔ مجھے ان کی یہ مصروفیت اچھی لگی۔

ہمارے ہاں کب ہوتا ہے ایسا؟

کہ گھر کے بڑے بزرگ یوں جی بہلانے کو باہر نکل جائیں۔۔۔۔ کسی ریسٹورنٹ میں جا بیٹھیں۔۔۔۔ کچھ وقت گپ شپ میں گزاریں۔ وسائل کے ہوتے ہوئے بھی ہمارے بڑوں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی میری امی جان اور ابا جان یوں کسی ریسٹورنٹ میں گئے ہوں یا میرے ساس سسر (خالہ خالو) نے ہوٹلنگ کے لیے وقت نکالنے کی کوشش کی ہو۔ یہ چونچلے انہوں نے کئے ہی نہیں۔ نہ عورتوں نے فرمائش کی اور۔۔۔۔ نہ مردوں نے ایسی کوئی خواہش ظاہر کی۔ ہم اردو سپیکنگ گھرانوں کے مرد دراصل عورت کو چولہے چکی سے نکلنے ہی نہیں دیتے تھے۔ ہمارے ہاں مرد کی محبت کا رستہ معدے سے ہو کر دل تک پہنچتا ہے۔ مرد اپنی عورتوں کے سلیقے اور ذائقہ دار پکوانوں کی تعریفوں کے پل باندھتے رہتے اور بے چاری بھولی بھالی عورتیں سِل بٹے پہ گھنٹوں مصالحے پیستیں۔۔۔۔ مشکل مشکل کھانے بناتیں اور بدلے میں تعریفیں سن کے نہال ہو جاتیں۔ ہماری اس دور کی عورتوں کی تفریح تو بس۔۔۔۔ انارکلی سے شاپنگ اور بانو بازار کی چاٹ تک ہی محدود تھی یا پھر پوری فیملی۔۔۔۔ تانگہ بھر کے سینما ہال پہنچ جاتی اور تین گھنٹے باکس میں گزار کے شاداں وفرحاں واپس لوٹتی۔

مجھے لگا! یہاں زندگی زیادہ خوبصورتی کے ساتھ بتائی جاتی ہے۔۔۔۔

بنا کسی سے آس لگائے۔۔۔۔ بنا کسی کو باتیں بنائے یہاں لوگ اپنی زندگی جی رہے ہیں۔ گھروں کی جڑت یہاں مضبوط ہے۔ عورت کا احترام بھی موجود ہے۔ اسی لیے تو گھر کی فضا سے نکل کے یہ لوگ کچھ وقت کھلی فضا میں اپنوں کے ساتھ گزارتے ہیں اور زندگی میں محبت کے رنگ بھرتے ہیں۔

نور لیڈیا کی شادی اور پاکستانی ماں

ہم نے اپنے بڑوں سے یہی سنا تھا جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں مگر۔۔۔۔
اِس دیس میں تو یہ کہاوت غلط ثابت ہو گئی تھی صبح آنکھ کھُلی تو موسم صاف بلکہ ۔۔۔۔بہت ہی صاف تھا پھر اچانک گرج چمک ہونے لگی۔ کتنی ہی دیر بادل شور مچا کے اپنے ہونے کا یقین دلاتے رہے۔ میں نے دروازہ کھول کے باہر جھانکا۔

نیلے آسمان کے آنچل پہ گہرے سرمئی بادلوں کے پھول کھلے تھے۔ ہلکی سنہری دھوپ اور سرمئی بادلوں کے امتزاج نے فضا کو رومانوی بنا دیا تھا اور پھر۔۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے کالی گھٹا آئی اور جھٹ پٹ برس گئی۔ ٹرونو مائنز کی اس بستی پہ بارش اپنے پورے حسن کے ساتھ برسی تھی۔ کچھ دیر بعد جب بارش تھمی تو میں باہر باغیچے میں چلی آئی۔

بارش رک گئی تھی مگر رِم جھم بوندوں کی جلترنگ اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ درختوں کے پتوں میں اٹکی ہوئی بارش کی یہ بوندیں۔۔۔۔ جب چکنی سرمئی سڑک پہ گرتیں تو موتیوں کی طرح بکھر جاتی تھیں۔ بارش کی بوندوں کی یہ ملہار جب کانوں میں رس ٹپکاتی تو۔۔۔۔ بے سبب دل میں خوشی کی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگتی تھیں۔ پہلے تو میں اس جلترنگ سے محظوظ ہوتی رہی۔ قوس قزح کے شوخ رنگوں کی جادوگری دیکھتی رہی اور پھر۔۔۔۔ کتنی ہی دیر ٹرونو مائنز کی بھیگی کشادہ سڑکوں پہ پھرتی رہی۔ نکھری نکھری ہریاول دیکھ کے اس دیس کی شادابی کو سراہتی رہی۔

عجب سرزمین ہے یہ۔۔۔۔ جہاں نظر ڈالو سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے۔

میں ان سرسبز پودوں۔۔۔۔رکن من رکن من بوندوں اور قوس وقزح کے رنگوں میں محو تھی اور ارم مجھے کھوجتی ہوئی باہر چلی آئی تھی۔

کہاں چلی گئی تھیں آپ؟ اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ کب سے ڈھونڈ رہی ہوں آپ کو۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا، وہ حواس باختہ لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ لکھی پریشانی کی یہ تحریر مجھے اس کے بچپن کے دن یاد دلا گئی۔

میں بھی تو اس کے سکول، کالج سے ذرا سی دیر ہو جانے پر اسی طرح پریشان ہو جایا کرتی تھی۔ اس وقت اس کی وہی کیفیت تھی۔

سچ کہا ہے کسی نے۔۔۔۔بیٹیاں بڑی ہو جائیں تو ماں پہ اپنی محبت کے سائبان تان دیتی ہیں۔

آئیں ناشتہ کر لیں۔ افضال آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما اور اندر لے آئی جہاں سلیقے سے سجی میز ہماری منتظر تھی۔ میری دھان پان سی بیٹی اپنے چہرے پہ ممتا کی جگمگاہٹ لئے تعبیر کو سنبھال رہی تھی اور ہمیں بھی ناشتہ کروا رہی تھی۔ میں اسے یہ سب گھر گرہستی نمٹاتے دیکھ کے سوچ رہی تھی کہ ابھی کل تک میری انگلی پکڑ کر۔۔۔۔میرے ساتھ ساتھ چپکی رہنے والی۔۔۔۔

فرخ کے ساتھ اس کی ہر شرارت اور ہر کھیل میں ساجھے داری کرنے والی۔۔۔۔سکول وین کے نہ آنے پر بھل بھل رو دینے والی۔۔۔۔اب کتنی ذمہ داری سے گھر سنبھالے ہوئے تھی۔

اس وقت مجھے اپنی بیٹی پہ بہت پیار آیا اور اپنی تربیت پہ فخر ہونے لگا۔ میں جو برسوں عاصمہ جہانگیر کے ادارے سے وابستہ رہی، اس کے ساتھ عورتوں کے حقوق کی جدوجہد میں شامل رہی، عورت کو ہمیشہ سربلند دیکھنے کی تگ و دو کرتی رہی مگر۔۔۔۔یہ سب کرتے ہوئے بھی میں

عورت کی گھر سے جڑت کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہ کر سکی۔ گھر چھوڑ کر۔۔۔۔ شوہروں سے لڑ جھگڑ کر "دستک" میں پناہ لینے کے لیے آنے والی لڑکیوں کو عورتوں کو ہمیشہ یہ سمجھاتی رہی کہ گھر ۔۔۔۔ اگر کنواں ہے تو باہر کی دنیا ایک کھائی ہے۔ لہذا مان جاؤ۔۔۔۔ جان جاؤ کہ یہ گھر ہی ہوتا ہے جو عورت کو مان دیتا ہے، جو عورت کو پہچان دیتا ہے۔ میں خیالوں کے تانے بانے بننے میں لگی تھی اور ارم جلدی جلدی گھر کے کام نمٹا رہی تھی کیونکہ رات کو افضال نے۔۔۔۔ گھر میں کچھ دوستوں کے طعام کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ میں جب سے یہاں آئی تھی افضال کے پاکستانی یونیورسٹی فیلوز کی طرف سے۔۔۔۔ مسلسل دعوت نامے موصول ہو رہے تھے۔

یہ سب بچے ایک پاکستانی ماں سے ملنے کے خواہاں تھے مگر یہاں۔۔۔۔ قیام کے محدود وقت کی پوٹلی سے لمحوں کے سکے کھن کھن گرتے ہی جا رہے تھے اور مجھے۔۔۔۔ ان کم ہوتے ہوئے لمحوں میں ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ اس ہرے بھرے شاداب ملک کی شادابیاں سمیٹنا تھیں۔۔۔۔ سمندر کے نیلگوں پانی کا سینہ چیرتی فیری (Ferry) کی سیر کرنا تھی۔۔۔۔ کیمرون ہائی لینڈ اور لنکاوی کی بلندیوں کو چھونا تھا۔۔۔۔ یہاں کے مختلف بیچز (Beaches) پہ جانا تھا اور ۔۔۔۔ سمندر کے پانیوں کو چرانا تھا۔ اس لئے فرداً فرداً سب کے گھر جانا اور دعوت شیراز کا لطف اٹھانا ممکن نہیں تھا۔ تبھی افضال نے کچھ قریبی دوست معہ بیگمات اپنے گھر بلا لئے تھے تا کہ ایک ہی وقت میں سب سے ملاقات بھی ہو جائے اور پاکستان کی یاد بھی تازہ کر لی جائے۔

ارم کو کام میں جتا دیکھ کر ایک ماں کا دل کڑھنے لگا تھا۔ اصرار کے باوجود وہ مجھے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دے رہی تھی۔ نوکر چاکر یہاں دستیاب نہیں اس لئے سارے کام۔۔۔۔ خود ہی کرنا پڑتے ہیں۔ یہ تو ہمارا پاکستان ہے جہاں۔۔۔۔ ہر متوسط گھر میں بھی کام والی ماسی کا وجود لازمی ٹھہرا لیا گیا ہے۔ بڑے بڑے گھروں اور ملازمت پیشہ خواتین کا ماسیوں پہ انحصار کرنا تو سمجھ میں آتا ہے مگر۔۔۔۔ چھوٹے چھوٹے گھروں میں بھی اب "ماسی" دکھائی دیتی ہے۔ شاید یہ بھی

اسٹیٹس سمبل بن گیا ہے۔

شام اتری تو مہمانوں کے قافلے بھی اتر آئے۔ میری بیٹی کا چھوٹا سا اپارٹمنٹ قہقہوں سے گونجنے لگا۔ ٹرونو مائنز میں اس وقت پاکستان کے ثقافتی رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ یہ سب نوجوان جوڑے آپس میں گھلے ملے تھے۔ یہ سب یہاں حصولِ علم کے لئے آئے تھے۔ پڑھتے پڑھاتے بھی تھے اور خوب گھومتے پھرتے تھے، دکھ تکلیف میں اک دوجے کا ساتھ بھی دیتے تھے۔

پردیس میں دیس والوں کی جرٔت مجھے اچھی لگی تھی۔ یہ سب بھی ایک پاکستانی ماں سے مل کے خوش تھے۔ کہیں اجنبیت کا شائبہ تک نہ تھا۔ خوش گپیاں چلتی رہیں۔۔۔۔ کھانے اور چائے کے بعد بھی یہ محفل دیر تک جمی رہی۔ افضال نے لوک گیت سنائے اور میں نے سب کی فرمائش پر تھوڑی سی شاعری سنائی۔ دس بارہ سامعین کی یہ نشست رات گئے جب برخاست ہوئی تو دو پروگرام بن چکے تھے۔ ویک اینڈ پہ کیمرون ہائی لینڈ جانا تھا اور اس سے پہلے نورلیڈیا منصور کی شادی میں شرکت کرنا تھی جو یہیں قریب ہی ٹرونو مائنز کی مکین تھی اور اس وقت بھی محفل میں موجود تھی۔ اس شادی میں میری شمولیت بھی یقینی ہوگئی تھی کہ نورلیڈیا منصور نے مجھے خاص طور پہ آنے کی دعوت دی تھی۔

نورلیڈیا منصور اور اعظمی پُشتم دونوں کلاس فیلو تھے۔ شادی پسند سے ہو رہی تھی جو ملائیشیا میں بری نہیں سمجھی جاتی کھلے دل اور کھلے ذہن کے معاشروں میں ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔

یہ۔۔۔ پردے میں زردے نہیں پکاتے۔

نورلیڈیا نے اعظمی پُشتم کو اپنے والدین سے ملوا دیا تھا اور اب شادی کے بندھن میں بندھنے والے تھے۔ ملائیشین شادی میں شرکت کا موقع نورلیڈیا نے فراہم کیا تھا اور اس مقامی

شادی کو دیکھنے کے شوق نے مجھے اتا ولا کر رکھا تھا۔ ہمیں رسم مہندی کا بلاوہ بھی تھا۔ اس میں سب کا جانا یوں ضروری تھا کہ نور لیڈیا ۔۔۔ اسی بستی کے شروع میں دو گلیوں کے فاصلے پر رہتی تھی۔ جہاں پہنچ کے مجھے کچھ مایوسی ہوئی کہ یہ تو کسی طور بھی شادی والا گھر نہ لگتا تھا۔ یہاں نہ مصنوعی روشنیاں تھیں ۔۔۔ نہ ڈی جے کا شور تھا بس گھر کی بڑی بوڑھیاں تھیں اور نور لیڈیا کی کچھ سہیلیاں۔

مہندی کی رسم سنا تھا ان کے ہاں ۔۔۔ بڑی اہم ہوتی ہے۔ دف بجائی جاتی ہے ۔۔۔ گل پاشی کی جاتی ہے ۔۔۔ سہیلیاں کھُسر پھُسر کرتی ہیں اور دلہن گلنار ہوئی جاتی ہے۔ سب کچھ ایسا ہی تھا مگر مہندی کی اس رسم میں سادگی تھی، نمائش نہیں تھی ۔۔۔ فضول خرچی نہیں تھی ۔۔۔ لڑکیاں رونق لگائے ہوئے تھیں اور گھر کی عمر رسیدہ خواتین بڑے بڑے دیگچوں میں کھانا تیار کر رہی تھیں۔ ہم کچھ دیر ہی رُکے کہ نہ تو ہمیں ۔۔۔ ان کے گیت سمجھ آ رہے تھے اور نہ ہی یہ روکھی پھیکی ۔۔۔ اندھیروں میں ڈوبی مہندی اچھی لگ رہی تھی اپنے ہاں تقریبات کی چکا چوند میں جو رنگینی دکھائی دیتی ہے وہ یہاں نہ تھی۔

مہندی کی رسم ختم ہو چکی تھی مگر کفگیر اور چمچے کرچھے رات بھر مسلسل اس بستی میں ساز بجاتے رہے تھے کہ ۔۔۔ شادی دوپہر کی تھی اور یہ ساری خواتین کل دوپہر کے لئے کھانے خود گھر میں تیار کر رہی تھیں۔

ہم نور لیڈیا کی بارات آنے سے کچھ ہی دیر پہلے وہاں پہنچے تھے۔ افضال اور باقی لڑکے بارات میں شامل ہونے کے لئے چل دیے تھے کینوپی میں جو مہمان موجود تھے۔ ان میں بہت سی خواتین بھی تھیں۔ سادہ چہروں اور سادہ کپڑوں میں ملبوس ان عورتوں کو دیکھ کے مجھے ہرگز یہ نہیں لگا کہ یہ سب شادی کی تقریب میں شرکت کے لئے آئی ہوئی ہیں۔ ان سب خواتین کا پہناوا تقریباً ایک سا ہی تھا۔ مرد و خواتین سب اپنے قومی لباس پہنے ہوئے تھے۔

اتنی روکھی پھیکی شادی دیکھ کے میرا تو دل ہی بجھ گیا۔

مجھے اپنی پاکستانی شادیاں یاد آنے لگیں۔

جہاں نت نئے فیشن دکھائی دیتے ہیں۔ برانڈڈ کپڑے۔۔۔۔ بہترین میک اپ۔۔۔۔ طلائی اور مصنوعی زیورات میں لدی پھندی خواتین نظر آتی ہیں۔ آنچلوں کی برسات میں خوشبوؤں کے لپٹے اٹھتے ہیں اور آس پاس والوں کو اپنی طرف متوجہ کر جاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں ہفتوں پہلے تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں بلکہ ہمارے ہاں تو۔۔۔۔ شادیوں میں ٹھور بناتے بناتے اکثر گھروں کے بجٹ تہس نہس ہو جاتے ہیں۔۔۔۔ قرضے چڑھ جاتے ہیں مگر۔۔۔۔

یہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ یہاں کسی کو ناک کٹنے کی فکر نہیں تھی۔ نہ ہی دلہن کے والدین نے بھاری بھر کم جہیز دینے کا وعدہ کیا تھا اور نہ ہی۔۔۔۔ اعظمی پُشتم یا اس کے گھر والوں نے کوئی تقاضہ کیا تھا کہ یہاں ایسا کچھ ہوتا ہی نہیں۔ سادگی میں آسودگی تلاش کی جاتی ہے۔ ایسا نہیں کہ نور لیڈیا کا گھرانہ خوش حال نہ تھا سب کچھ تھا ان کے پاس مگر یہ لوگ تصنع اور بناوٹ سے دور تھے۔ صرف یہی شادی ایسی نہیں تھی۔ افضال بتا رہے تھے کہ عموماً یہاں شادیاں اسی طور سادگی سے کی جاتی ہیں۔

اس پوری کینوپی میں سوائے دلہن کے مجھے کوئی عورت مہنگے ملبوس اور تیز میک اپ میں نظر نہیں آئی تھی۔ کینوپی میں موجود ملائیشین خواتین کی سرگوشیاں تیز ہوئیں اور ان کی گردنوں کے رُخ۔۔۔۔ داخلی دروازے کی طرف مُڑے تو۔۔۔۔ ہم پاکستانی خواتین نے بھی اپنی آنکھیں اس طرف لگا دیں۔ جہاں فرموزا (دلہن کی بہن) دلہن کو لئے کینوپی میں داخل ہو رہی تھی۔ دلہن اپنے روایتی لباس (Baju Kurung) میں ملبوس تھی۔ نفیس سنہری کام کا سفید سارنگ پہنے، سر کو ڈھانپے نور لیڈیا بہت پیاری لگ رہی تھی۔ ہلکے سانولے رنگ پہ اس کا میک اپ کچھ اس انداز

سے کیا گیا تھا کہ ہر نقش اُجاگر ہو گیا تھا۔ ابھی ہم دلہن کا جائزہ لے رہے تھے کہ ڈرم بجنے کی آواز سنائی دی۔ ملائیشین بینڈ کی یہ آواز پہلے ذرا ہلکی تھی پھر تیز ہوتی چلی گئی۔

یہ بینڈ کی آواز یقیناً بارات کی آمد کا پتہ دیتی تھی اور پھر۔۔۔۔نہ پٹاخے چھوٹے ۔۔۔۔نہ ہوائی فائرنگ ہوئی بس دوستوں کے جھرمٹ میں بینڈ کے ردھم پہ۔۔۔۔دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اعظمی پُشتم کینوپی میں داخل ہوا۔

میں نے پھر ہوکا بھرا۔

ہائے ہائے نہ سہرا۔۔۔۔نہ گھوڑا۔۔۔۔نہ بگھی۔۔۔۔نہ کار اور نہ بارات آ گئی کا شور۔۔۔۔نہ مانگنے والوں کا ہجوم۔۔۔۔نہ ڈومنیوں کے تقاضے۔

اعظمی پُشتم نے بھی سفید باجو میلائن (Baju Melayn) زیب تن کیا ہوا تھا۔ لمبے بازوؤں والی قمیض اور پاجامے میں اعظمی پُشتم کا کالا رنگ خاصا چمک رہا تھا۔ سنہری تِلّے کے کام پر دھوپ پڑنے سے جو شعاعیں پھوٹتیں تو دولہا کے کالے رنگ پہ ہلکا سا سنہری رنگ بھی چھوڑے جاتیں۔ دولہا دلہن دونوں نے سر مکمل ڈھانپے ہوئے تھے۔ ان دونوں کو اکٹھے بٹھا دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی (Maken Berdemai) یعنی کھانے کی آواز لگا دی گئی تھی۔

یہ آواز سن کے لوگوں میں ہلچل تو ہوئی مگر۔۔۔۔بھگدڑ نہیں مچی۔

روٹی کھُلی۔۔۔۔مگر بندے نہیں کھُلے۔

سالن میں گائے کا گوشت تھا اور سفید چاول۔ ملائیشیا میں لوگ روٹی کم اور چاول زیادہ کھاتے ہیں۔ کہیں چلے جائیں آپ کو ناشتے میں۔۔۔۔دوپہر کے کھانے میں ۔۔۔۔رات کے کھانے میں چاول ضرور ملیں گے۔ سالن کئی قسم کے ہوں گے مگر۔۔۔۔روٹی نہیں ہوگی۔

سر ڈھانپے سارنگ پہنے جو عورتیں رات بھر جاگ کے گھر میں کھانا بناتی رہی تھیں اور

جن کے کفگیروں کے شور نے ٹرونومائنز میں خاصے جلترنگ بجا رکھے تھے۔اس وقت بھی وہ کھانا برتا رہی تھیں۔

کھانا ختم ہوا تو رسمیں شروع ہو گئیں۔دولہا دلہن پر پہلے چاول پھینکے گئے۔جس کی نسبت شادی خانہ آبادی کی کامیابی سے منسوب کی گئی تھی۔

پھول پتیاں نچھاور کی گئیں۔اس کے ساتھ ہی تخت کے ارد گرد لڑکیوں بالیوں نے گھیرا ڈال دیا۔شاید کوئی رسم ہو رہی تھی جو میں چاہنے کے باوجود نہ دیکھ سکی کہ۔۔۔۔میری نوجوان پاکستانی لڑکیوں نے ہمت ہی نہ کی تھی میرے ساتھ وہاں تک جانے کی۔اس رسم شادی میں لفافے چل رہے تھے۔دولہا اور دلہن کو سلامی دینے کا رواج یہاں بھی تھا لیکن۔۔۔۔یہاں ایک اور رواج بھی تھا جو۔۔۔۔ہمارے ہاں نہیں کہ یہاں شادی میں آنے والے مہمانوں کو گھر والے کچھ نہ کچھ گفٹ دے کر رخصت کر رہے تھے ہمیں بھی سوونیئر اور مٹھائی دے کر الوداع کیا گیا۔

ہم تو وہاں سے رخصت ہو گئے مگر نور لیڈیا رخصت نہیں ہوئی تھی۔اپنے رسم و رواج کے مطابق۔۔۔۔

اعظمی پُشتم کو ہی یہاں دلہن کے گھر قیام کرنا تھا۔ان لوگوں کی ایک اور رسم جو مجھے اچھی لگی وہ یہ کہ۔۔۔۔اس دیس میں لڑکیاں بوجھ نہیں سمجھی جاتیں۔ان کی شادی کے اخراجات والدین کو ادھ موا نہیں کرتے بلکہ یہاں تو۔۔۔۔یہ سب کچھ دولہا کی طرف سے ہوتا ہے۔وہ اپنے گھر کا سامان خود لاتا ہے۔خود گھر سجاتا ہے اور پھر اس سجے سجائے گھر میں اپنی دلہن لے آتا ہے۔

کیمرون ہائی لینڈز۔۔۔ایک طلسم

سپیدۂ سحر ابھی پوری طرح نمودار نہیں ہوا تھا کہ۔۔۔

ٹرونو مائنز کے پُر ہول سناٹے کو ہارن کی آواز نے توڑ دیا۔ رات بھر باہمی مشوروں کے لئے ٹیلیفون کی گھنٹیاں بجتی رہی تھیں اور اب علی الصبح گاڑیوں کے ہارن بجنے لگے تھے۔

یہ ہارن گویا سب سیرانی ساتھیوں کی آمد کا اعلان تھے اور پھر چند ہی لمحوں کے بعد پیٹروناس یونیورسٹی کے چھ طالب علم معہ بیوی بچوں کے ٹرونو مائنز سے نکلے اور ملائیشیا کے سب سے اونچے اس پہاڑ کی سیر کو چل دیے جسے۔۔۔دیکھنے کی خواہش میرے جی میں تھی اور جسے دیکھے بنا میں اس دیس سے واپس جانا نہیں چاہتی تھی کہ۔۔۔اس پہاڑ کے دامن میں چائے کے مخملیں باغات تھے۔۔۔گہرے ہرے کائی رنگے گھنے جنگلات تھے۔۔۔لیونڈر گارڈن تھے۔۔۔چیری اور اسٹرابری کے فارم تھے۔۔۔کیکٹس نگر تھا۔۔۔روز ویلی تھی اور جہاں اورنگ اصلی بھی تھے۔۔۔وہی اورنگ اصلی جو۔۔۔ملائیشیا کے قدیم باشندے تھے اور جو ابتدائی تجارت میں۔۔۔نوواردوں پہ جنگل کے بھید کھولتے تھے اور انہیں۔۔۔یہاں کی قیمتی دھاتوں کے بارے خفیہ معلومات فراہم کرتے تھے گویا یہ گھر کے بھیدی تھے اور لنکا ڈھاتے تھے۔

کیمرون ہائی لینڈز (Cameron Highlands)

ملائیشیا کی ریاست پاہانگ (Pahang) میں آسمان کی بلندیوں کو چھوتا ہوا یہ خوبصورت خطہ ۔۔۔۔جس کا کچھ حصہ مغرب کی سمت ریاست پیراک سے جڑا تھا اور اپوہ سے جس کی دوری صرف نوے کلومیٹر تھی مگر اس مختصر سی مسافت کے لئے بھی ۔۔۔۔ہماری پاکستانی سہاگنوں نے بھرپور تیاری کی تھی اور اس اکلوتی ۔۔۔۔مشترکہ ساس کی خوشنودی کو ان سب نے رت جگا کاٹا تھا اور مزے مزے کے پکوان تیار کئے تھے کہ ملائیشیا کے روکھے پھیکے کھانے ۔۔۔۔ہم چٹ پٹے پاکستانیوں کو پسند جو نہیں آتے۔ان پاکستانی بہو بیٹیوں کے یہ جوہر تو اپوہ میں کھلے کہ اپوہ ریلوے اسٹیشن ۔۔۔۔ہمارے اس سفر کا پہلا پڑاؤ تھا۔اپوہ ریلوے اسٹیشن کے صاف ستھرے ویٹنگ روم میں جب انواع واقسام کے ناشتے کی پٹاری کھلی تو میں نے ۔۔۔۔دل کھول کے ان سب کی تعریف کی۔اپنی اس اکلوتی بزرگ ہم سفر کی ستائش نے جہاں ان لڑکیوں کو ہشاش بشاش کیا وہیں ۔۔۔۔نوجوانوں کے چہرے بھی بیگمات کی تعریف پر خوشی سے کھل اٹھے۔قہقہوں کی جلترنگ میں ہم ناشتے سے لطف اندوز ہو کر اپوہ سے نکلے اور تاپہہ (Tapah) انٹر چینج جا پہنچے کہ بلندیوں کا سفر یہیں سے شروع ہونا تھا۔

رستے میں ہر طرف شادابیاں تھیں ۔۔۔۔درختوں کے جھنڈ تھے ۔۔۔۔کچی پکی بستیاں تھیں ۔۔۔۔سڑک کنارے لگے ہوئے سٹال تھے جہاں چھاتے تان کے ۔۔۔۔ملئے اور چینی خواتین کاروبار میں الجھی ہوئی تھیں کہ اس ملک کے بے اعتبارے موسم میں ۔۔۔۔بارش کبھی بھی اپنا جلوہ دکھا سکتی تھی۔اس وقت بھی رکن رمن ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی جاتی تھی۔ شاداب رستے بل کھاتے ہوئے بلندیوں کی طرف جاتے تھے۔گہرے سرمئی بادل منڈلاتے تھے اور ہریاول مستیاں دکھاتی تھی۔راہ میں مندر، مسجد، یا کوئی شاندار سی عمارت ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی تو ہم سب ۔۔۔۔نظریں چرائے آگے بڑھ جاتے تھے کہ چلتے سمے متفقہ فیصلہ یہی کیا گیا تھا کہ رستے کی رنگینیوں میں الجھے بغیر ۔۔۔۔زیادہ سے زیادہ وقت پہاڑ کی گود میں گزارا

جائے۔۔۔دن کی روشنی میں یہاں کی اترائیوں، اونچائیوں اور گہرائیوں کے منظر دیکھے جائیں اور شام کو جب۔۔۔سورج واپسی کا رستہ ناپے تو ہم سب بھی گھروں کو پلٹ آئیں۔لہذا کہیں بھی بغیر رُکے ہماری گاڑیاں دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی اونچائی کا سفر طے کرتی رہیں۔۔۔۔ پہاڑیوں، گھاٹیوں، ٹیلوں نے اپنے جوبن سے ہمیں پرچانا چاہا۔۔۔سبز مخملیں دوشالہ اوڑھے چائے کے باغات بھی اپنی طرف بلاتے رہے۔۔۔پھلوں اور پھولوں سے لدے فارم دل لبھاتے رہے مگر۔۔۔ہم واپسی پہ انہیں دیکھنے کا ارادہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ۔۔۔تنگ وتاریک گھمن گھیریوں میں گھومتے گھامتے ہم کیمرون ہائی لینڈ آ پہنچے۔

کیمرون ہائی لینڈز۔۔۔ملائیشیا کا ایک خوبصورت ہل اسٹیشن ہے۔یہ سب سے اونچا پہاڑی سلسلہ ہے جسے اسٹیشن ہے برطانوی جنرل ولیم کیمرون (William Cameron) نے متعارف کرایا اور جنگل میں منگل کا سماں باندھ دیا۔یہ ان دنوں کی بات ہے جب برطانیہ اور ہالینڈ نے 1824ء میں جنوب مشرقی ایشیاء کے علاقے آپس میں بانٹ لئے تھے۔انڈونیشیا ولندیزیوں کے قبضے میں رہا اور ملائیشیا اور سنگاپور وغیرہ انگریزوں کے حصے میں آ گئے۔اسی برطانوی دور میں 1885ء میں جنرل ولیم کیمرون (William Cameron) کو نوآبادیاتی منصوبے کے سرویئر کی ذمہ داری سونپی گئی۔ولیم کیمرون نے ملائیشیا کے ان پہاڑوں تک پہنچ کے جان کاری حاصل کی۔حد درجہ اونچائی پر اس نے کچھ زمین کو کشادہ اور ہموار پایا۔۔۔پہاڑوں میں بنتے بھنور دیکھے۔۔۔گھنے جنگلات کی بھول بھلیاں دیکھیں۔ریاست پاہانگ اور ریاست پیراک کی سرحدی پیمائش کی اور شاندار منصوبے بناتا ہوا ان پہاڑوں سے اتر آیا۔ان پہاڑوں میں گھری ہموار زمین پہ سینی ٹوریم اور فارم بنانے کی تجویز کے ساتھ اس نے۔۔۔اپنی رپورٹ پیراک کے ریذیڈنٹ سر ہیوگ لو (Sir Huge Low) کو پیش کر دی مگر۔۔۔اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں چالیس برس لگ گئے۔جب سر

جارج میکس ویل (Sir George Maxwell) نے اس پہاڑی علاقے کا وزٹ کیا تو بنا کسی تامّل کے ۔۔۔۔ یہاں ہل اسٹیشن بنانے کا حکم صادر کر دیا۔

تعمیراتی کام شروع کر دیا گیا مگر ۔۔۔۔ ان پُر پیچ رستوں پر سڑک کی تعمیر بھی ایک کڑی آزمائش تھی۔ اتنی بلندی پر مشینری اور میٹریل کی رسائی ایک مشکل کام تھی مگر ۔۔۔۔ یہاں کے ناسازگار موسم میں جب ملیرے کی وبا پھوٹی اور ان گنت مزدور لقمۂ اجل بن گئے تب ۔۔۔۔ سراسیمگی ضرور پھیل گئی تھی مگر حوصلے نہیں ٹوٹے تھے ۔۔۔۔ کام نہیں رکا تھا سو ٹیڑھی میڑھی بل کھاتی گھاٹیوں اور گھنے جنگل کی بھول بھلیوں میں بھی یہ مشکل مرحلہ طے ہو گیا اور 1930ء تک کیمرون ہائی لینڈ نے ایک خوبصورت اور مقبول سیر گاہ کا روپ دھار لیا۔

سڑک مکمل ہوتے ہی انگریزوں نے اپنی ضرورت اور سہولت کی ہر چیز یہاں مہیا کی ۔۔۔۔ عمارتیں بنوائیں ۔۔۔۔ ادارے بنائے ۔۔۔۔ یہاں کی آب و ہوا سے مطابقت رکھنے والے پھل اور پھول لگوائے ۔۔۔۔ چائے کے باغات اور سبزیوں کے فارم لگائے ۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے تک یہ علاقہ ترقی کی سرحدیں پھلانگتا رہا۔ زمین سونا اُگلتی رہی اور ملائیشیا کے وسائل سے ہونے والی آمدن ۔۔۔۔ برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک کو خوشحال بناتی رہی مگر جب ۔۔۔۔ جاپانی ملائیشیا پر قابض ہوئے تو ترقی کا یہ سفر رک گیا۔ جاپانیوں کی پسپائی کے بعد برطانوی پھر سر اٹھانے لگے مگر تب تک مقامی لوگوں نے غلامی کا طوق اتارنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ آزادی کی زوردار تحریک چلی تو انگریزوں کو بھی دُم دبا کے بھاگنا پڑا۔ ملائیشیا پہ نیک نیت حکمران تخت نشین ہوئے تو یہ جگہ ۔۔۔۔ امن کا گہوارہ بن گئی اور اب بھی یہ جگہ جائے امن ہے ۔۔۔۔ گوشۂ عافیت ہے ۔۔۔۔ جنت نظیر ہے اور کہتے ہیں کہ یہاں ۔۔۔۔ اس جیسا دوسرا کوئی نہیں۔ حکمرانوں نے بھی اپنے اس حسین اثاثے کی خوب حفاظت کی اور پھر دنیا بھر سے لوگ یہاں آنے لگے اور سیاحت نے ۔۔۔۔ اس ملک کو مالا مال کر دیا۔

بہت سے پہاڑوں میں جگہ بناتا۔۔۔ انہیں پسپائی سے پیچھے ہٹاتا اور انتہائی بلندیوں کو گلے لگاتا ہوا کیمرون ہائی لینڈز کا یہ جدید قصبہ کلنب ماؤنٹ برنچنگ (Climb Mount Brinchang) ہمارے سامنے تھا۔ پہاڑ کے دامن میں آباد اس قصبے کی تازہ خالص ہوا اور بھیگی بھیگی فضا نے رستے کی کٹھنائیاں ہمیں یکسر بھلا دی تھیں۔ اس ریزورٹ کے چاروں طرف ہوٹل دکھائی دیتے تھے جن میں۔۔۔ برطانوی طرز تعمیر جھلکتی تھی اور مجھے شملہ (انڈیا) کی یاد دلاتی تھی۔ شملہ بھی اسی طرح کے ہوٹلوں میں گھرا ہوا ہے۔ میرے سامنے سموک ہاؤس (Smoke House) اور لیک ہاؤس (Lake House) تھے جو۔۔۔ یقیناً انگریز افسروں کی رہائش گاہ رہی ہوگی۔ ایک طرف گولف ہاؤس تھا اور دوسری طرف سیم پوہ (Sam Poh) ٹیمپل تھا۔ دور تانارٹہ (Tanah Rata) سے نکلنے والے اس پوری وادی کا طواف کرنے والے۔۔۔ چودہ رستے نکلتے دکھائی دیتے تھے جو پگڈنڈیوں کی صورت ان گھنے جنگلوں میں گم ہو جاتے تھے اور جہاں جیپ یا گاڑی جاتی تو نظر آتی تھی مگر آگے کہیں اس کی ہلکی سی جھلک بھی نہ دکھائی دیتی تھی۔ یہاں ہوا جنگلی پھولوں کی باس لئے آتی تھی اور من لبھاتی تھی۔ چائے کی مسحور کن خوشبو بھی دل للچاتی تھی کہ یہاں کی چائے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس ریزورٹ کے قریب ہی گیلریا ٹائم ٹنل تھی جس میں۔۔۔ کیمرون ہائی لینڈز کی تاریخ بکھری ہوئی تھی۔ پرانی تصاویر۔۔۔ پرانے کارڈز۔۔۔ پرانی چیزیں۔۔۔ گویا اس ٹنل سے ہم گزرے ہوئے وقت کو دیکھ رہے تھے۔ یہ کوئی بڑا میوزیم نہیں تھا مگر ماضی کی جھلکیاں اسے اہم بنائے ہوئے تھیں ۔ہم اس ٹنل سے نکلے تو کیکٹس ویلی چلے آئے۔

کیکٹس کی اس وادی میں ہمیں کیکٹس کی بہت سی اقسام نظر آئیں۔ کیکٹس پہ خوشنما کھلتے پھول بھی ہم نے یہاں دیکھے اس کے قریب میں ہی بگ ریڈ (Big Red) اسٹرابری فارم تھا جہاں۔۔۔ بڑے سائز کی اسٹرابری کی کاشت ہوتی ہے اور یہاں سے دوسرے ممالک

میں بھی سپلائی کی جاتی ہے۔اس فارم کا تھوڑا سا وزٹ کر کے ہم اس خوبصورت کیفے میں چلے آئے جہاں ۔۔۔تازہ سرخ اسٹرابری سے آئس کریم بنائی جارہی تھی۔ بچے، بڑے اور میں سب ہی اس آئس کریم سے مستفید ہوئے اور الوداعی نظر ڈال کے یہاں سے نکلے کہ وقت کم تھا اور مقابلہ سخت ۔۔۔ ہمیں بہت سی اور جگہیں دیکھنا تھیں۔ سو قریب ہی راجو ہلز (Raju Hills) اسٹرابری فارم تھا۔ جسے لمحہ بھر کو بس دور سے ہی دیکھا وہ بھی دھندلا دھندلا سا نظر آیا کہ اس جگہ کا نام ہی مسٹی ویلی (Misty Valley) رکھا گیا تھا۔ یہاں بھی اسٹرابری کے باغات تھے اور انہیں جالیوں سے ڈھانپا ہوا تھا۔

راجو ہلز کے قریب جونہی بٹر فلائی گارڈن نے ہمیں آواز دی ۔۔۔ ہم لپک کے اس تک جا پہنچے کہ کیمرون ہائی لینڈز کی سیر میں ۔۔۔ یہ فارم بھی دیکھنے ضروری ہو گئے تھے۔ یہاں کا بٹر فلائی گارڈن بھی بہت خوبصورت منظر دکھا رہا تھا۔ مختلف رنگوں کی تتلیاں یہاں اڑانیں بھرتی رہی تھیں کہ ۔۔۔ان کے لئے یہاں پھولوں کی چادر بچھائی گئی تھی۔ تتلیاں اس مہکتی چادر پہ لوٹنیاں لگاتیں ۔۔۔ یہاں ڈال ڈال منڈلاتیں اور اُڑ جاتی تھیں مگر ۔۔۔ اُڑ کر بھی وہ کہیں نہیں جاتی تھیں کہ اس باغ کو جالی کی چھت سے ڈھک دیا گیا تھا جو ۔۔۔ ان تتلیوں کو بے گھری سے بچاتی اور بھٹکنے نہیں دیتی تھی۔ میں نے چھت پہ نظر ڈالی۔ جالی کی چھت پہ تتلیوں کی چادر تنی تھی ۔چھت سے چپکی یہ تتلیاں جالی کو بھی رنگین بنائے ہوئے تھیں۔ یہ نیلی، پیلی، سرخ، عنابی، چتکبری تتلیاں مجھے اپنا گاؤں یاد دلا گئیں جہاں ہم گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے جاتے تھے اور موقع ملتے ہی باغ میں جا کے تتلیاں پکڑنے کی ناکام کوششیں کیا کرتے تھے اور اگر کبھی کوئی تتلی ہاتھ آجاتی تو اس کا ریشمی لمس سنبھالنے کی کوشش میں ہی اسے ہاتھوں سے نکال دیتے تھے اور پھر ۔۔۔ دیر تک افسردہ سے انگلیوں کی پوروں کو دیکھا کرتے تھے کہ تتلی پکڑنے کی خوشی ۔۔۔ اسے گنوا دینے کے دکھ میں بدل جاتی تھی۔

مسلسل تین گھنٹے سے ہم کیمرون ہائی لینڈز کی وادیوں میں گھوم رہے تھے۔سرمئی بادلوں نے پوری وادی کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔لمحہ بھر کو سورج نے اپنی مُندی آنکھیں کھولنا چاہیں مگر بادلوں کی منہ زوری کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔بادل پھر اتنے زور سے گرجے کہ سورج کو اپنا منہ چھپانا ہی پڑا۔اس گرج چمک کے ساتھ ہی یوں چھاجوں مینہ برسا کہ روز ویلی (Rose Valley) کی طرف۔۔۔۔بڑھتے قدم رک سے گئے۔

اس سمے یہ کیمرون ہائی لینڈز مُجھے پھولوں بھرا باغ لگ رہا تھا۔۔۔۔خوشبوؤں کے جوار بھاٹے اٹھاتا سمندر لگ رہا تھا ۔لیونڈر گارڈن کے پاس سے گزرے تو خوشبوؤں کی اٹھتی لپٹوں نے ہمیں اپنے حصار میں لے لیا۔ایک اچٹتی سی نگاہ ہم نے ان جامنی، کاسنی جھاڑیوں پر ڈالی اور اپنے قدم۔۔۔۔روز ویلی کی طرف بڑھا دے۔میں جب سے یہاں آئی تھی۔۔۔۔مسلسل گھوم پھر رہی تھی۔۔۔۔بہت سے باغ دیکھے تھے۔پارک اور شاہراہیں بھی گھوم لی تھیں۔۔۔۔اس ہرے بھرے دیس میں یوں تو سب کچھ ہی تھا مگر گلاب مُجھے کسی آنگن۔۔۔۔کسی پارک۔۔۔۔کسی باغ میں نہ ملا تھا۔میرے پاکستان میں تو۔۔۔۔گھر ہوں یا باغیچے ۔۔۔۔باغ ہوں یا پارک، سب گلاب کی مسحور کن خوشبو سے مہکے ہوئے ہوتے ہیں کہ ہمارے ہاں گلاب کے بغیر۔۔۔۔خوشبو کا سفر کچھ ادھورا ادھورا لگتا ہے۔

کہیں پڑھا تھا کہ ملائیشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد کو بھی میرے دیس کے گلاب بہت پسند آئے تھے۔بہت پہلے جب مہاتیر محمد پاکستان آئے تو ہمارے صحافیوں نے ان سے سوال کیا تھا کہ۔۔۔۔

پاکستان میں آپ کو کیا چیز پسند آئی؟

مہاتیر محمد نے شگفتہ لہجے میں مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔گلاب کے پھول۔

سرسبز وشاداب ہریالی بکھیرتے ملک ملائیشیا کے وزیر اعظم کا یہ جواب سب کو ہی ورطۂ

حیرت میں ڈال گیا تھا۔ پھر مہاتیر محمد نے پاکستان سے گلاب کی بہت سی قلمیں منگوائیں۔ وہ سب قلمیں لگوائیں مگر۔۔۔ ملائیشیا کی پامی فضاؤں نے انہیں پنپنے ہی نہیں دیا تھا۔

میں نے جب یہ پڑھا تھا تو بہت حیرت ہوئی تھی مگر اب۔۔۔ یہاں آ کے یقین ہو چلا تھا کہ ملائیشیا۔۔۔ پام نگری ہے گلابوں کی سرزمین نہیں۔

لیکن کیمرون ہائی لینڈز کی بلندیوں پہ روز ویلی نے میری ساری توجہ اپنی طرف کر لی تھی۔ ہمارے پاکستانی قافلے کے کچھ لوگوں کے بھوک کا شور مچانے کے باوجود ہم روز ویلی کی حدود میں داخل ہو چکے تھے اور میں انگشت بدنداں رہ گئی تھی کہ یہاں تا حدِ نظر گلاب ہی گلاب تھے۔ جن میں کچھ پھول بہت بڑے سائز کے نظر آئے۔ ایک قدرتی پہاڑی کے ساتھ مسز روبنسن کا روز گارڈن دکھائی دے رہا تھا۔ جہاں پنک کوئین وکٹوریہ اپنے جوبن پہ تھے۔ یہاں ایک خوبصورت سی گفٹ شاپ بھی تھی اور کیفے بھی مگر۔۔۔ ہم کہیں نہ رُکے۔ بس کچھ دیر کھڑے ہو کر نیچے وادی کا نظارہ کیا جہاں۔۔۔ دھند میں لپٹی لش گرین وادیاں تھیں۔۔۔ رولنگ پہاڑیاں اور حیران کن پہاڑی نظارے تھے جو۔۔۔ اپنا گرویدہ کیے جاتے تھے اور گرد و پیش سے بے نیاز کر دیتے تھے۔۔۔ اس محویت کو بھوک کے نعروں نے توڑا اور ہم اپنے ساز و سامان کے ساتھ ریسٹوران میکانن لاٹ (Restoran Makanan Laut) چلے آئے۔

اورنگ اصلی اور گھنا جنگل

کہتے ہیں فطرت کے حسن و جمال کی پہچان کا راستہ جنگل سے ہو کر گزرتا ہے مگر جنگل تک ابھی ہماری رسائی نہیں ہوئی تھی کہ پربتوں کی یہ شاہزادیاں اپنے سحر سے نکلنے ہی نہ دیتی تھیں۔گام گام ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی تھیں۔

کیمرون ہائی لینڈز کی ڈھلوانوں پہ قدم جمائے۔۔۔۔ درمیانے درجے کے اس ریستوران سے دور افتادہ اونچائیوں اور حد درجہ گہرائیوں کے۔۔۔۔ دلفریب منظر واضح دکھائی دیتے تھے۔برنچنگ (Brinchang) قصبے سے ذرا اور بلندی پر دائیں ہاتھ۔۔۔۔ سیم پو ٹیمپل (Sam Poh Temple) کی عمارت۔۔۔۔ بادلوں کے نرغے میں گھری نظر آتی تھی۔بالکل سامنے تھوڑی ڈھلان پر نیچے کیمرون ہائی لینڈز کا دوسرا قصبہ Tanha Rata دکھائی دے رہا تھا۔جس کے اردگرد بہت سی لکیروں کا جال بنا ہوا تھا۔یہ جال دراصل وہ چودہ پگڈنڈیاں تھیں جو جنگل کی طرف جاتی تو دکھائی دیتی تھیں مگر۔۔۔۔ اس کے بعد کچھ نظر نہ آتا تھا۔

اس سے تھوڑا ہٹ کے بائیں طرف ایک پرائیویٹ پہاڑی پر بنائے گئے ایک ہی طرز کے بنے ہوئے وہ پانچ خوبصورت بنگلے بھی سبزے کے جھنڈ میں گھرے ہوئے تھے جو برٹش گورنمنٹ کے انتظامی، دفتری امور نمٹانے کے لئے استعمال ہوتے تھے۔جنہیں باٹا ز ہولی ڈے شیلے (Bata's Holiday Chalet) کا نام دیا گیا تھا۔ان پانچ بنگلوں میں وہ مون لائٹ بنگلہ بھی تھا جہاں جم تھامسن۔۔۔۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ چھٹیاں گزارنے آیا اور عارضی

قیام پذیر ہوا مگر۔۔۔اس کا یہ عارضی قیام اس کی گمشدگی سے مستقل ہو گیا۔

جم تھامسن جو ایک امریکی مہم جو تھا۔ پرنسٹن یونیورسٹی کے اس گریجویٹ نے یونیورسٹی آف پنسلوانیا سے آرکیٹیکچر کی ڈگری حاصل کی اور۔۔۔نیویارک میں اعلیٰ سوسائٹی کے لیے گھروں کی ڈیزائننگ کرنے لگا۔ جم تھامسن نے اس شعبے میں خوب نام کمایا اور بہترین آرکیٹیکچر کے طور پر جب وہ شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگا تو۔۔۔اچانک اس نے یہ کام چھوڑ دیا اور دوسری جنگ عظیم کے دوران انٹیلی جنس ایجنسی کے ساتھ منسلک ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد اس کی بے چین طبیعت نے اسے یہاں بھی نہ ٹکنے دیا۔ اب اس نے سلک کمپنی بنانے کی ٹھانی اور تھائی سلک کمپنی کا۔۔۔کوفاؤنڈر (Co-founder) بن گیا۔ اس کمپنی نے جب خوب شہرت حاصل کر لی تو جم نے۔۔۔اسے بھی خیر باد کہا اور سیر و سیاحت کی طرف راغب ہو گیا۔

1967ء میں جم سیاحت کی غرض سے کیمرون ہائی لینڈز کی خوبصورت وادیوں میں آیا اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ۔۔۔باٹاز ہولی ڈے شلیے (Bata's Holiday Chalet) کے مون لائٹ بنگلہ میں قیام کیا۔ ان سب دوستوں نے ایسٹر یہیں منایا تھا۔ ایسٹر کی اس روشن اور چمکدار صبح میں وہ۔۔۔اپنے ساتھیوں کے ساتھ چرچ گیا۔۔۔عبادت کی۔۔۔مون لائٹ بنگلہ میں واپس آیا۔۔۔سب نے مل کے کھانا کھایا پھر۔۔۔آرام کیا اور شام کی چائے پینے لان میں چلے آئے۔ چائے کے چند گھونٹ جم نے لئے اور چائے کا کپ میز پہ رکھ کے کھڑا ہوا ہو گیا۔ سگریٹ بکس اپنی کرسی پہ رکھا اور "ابھی آیا" کہتے ہوئے بنگلے سے باہر نکل گیا۔ شام ڈھلے تک اس کے ساتھی وہیں بیٹھے اس کا انتظار کرتے رہے۔۔۔ٹھنڈ اتری تو وہ سب اپنے کمروں میں چلے آئے۔ شام سے رات ہو گئی۔۔۔جم نہیں آیا۔ صبح ہو گئی مگر۔۔۔جم واپس نہ آیا۔ جم کی گمشدگی نے بنگلے میں خوف و ہراس پھیلا دیا۔ پولیس۔۔۔مقامی باشندے۔۔۔سکاؤٹس سب نے ہی جم کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر۔۔۔

جم کوشاید زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔

وہ جنگل کی گھمن گھیریوں میں کہیں اُلجھ گیا تھا یا پھر خود ہی کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ اس پُر اسرار گمشدگی کا معمہ کسی طور حل نہ ہوا۔ کچھ لوگوں نے جاسوسی سرگرمیوں میں ملوث ہونے پر جم کے اغوا کر لئے جانے کا خدشہ ظاہر کیا اور کچھ نے۔۔۔ جنگلی جانوروں کے جم کو شکار کر لینے کی قیاس آرائی کی۔ کسی نے اورنگ اصلی باشندوں کے اسے لوٹ لینے کے بعد قتل کر دینے کی افواہ اڑادی اور کسی نے اس کے خود روپوش ہو جانے کا فسانہ گھڑ دیا مگر۔۔۔ اصل بات سامنے نہ آسکی اور یوں جم تھامسن۔۔۔ کیمرون ہائی لینڈز کی ان حسین وادیوں اور پُر اسرار گھنے جنگلوں میں ہی کہیں کھو گیا۔

مون لائٹ بنگلے کی اس پر اسرار روداد نے گھنے جنگل تک رسائی کا شوق ہوا کر دیا تھا بلکہ۔۔۔ تھوڑی سی مسافت پر بلیو ویلی (Blue Valley) کی جانب بڑھتے قدم بھی روک دیے تھے کہ یہاں سے یہ تھوڑی سی مسافت بھی۔۔۔ ایک گھنٹے کی طلبگار تھی جو ہمارے محدود وقت کے دائرے میں نہیں آتی تھی۔ ان پربتوں کے چپے چپے پہ بکھرے حسن کو سمیٹنے کے لئے صرف ایک دن ناکافی تھا اور اب تو۔۔۔ اس ایک دن میں سے بھی چند گنے چُنے گھنٹے ہی باقی بچے تھے۔ سو متفقہ فیصلے سے یہ قافلہ چائے کے باغات کی سمت چل دیا لیکن۔۔۔ رستے میں ای فنگ یو (EE FENG GU) ہنی بی فارم کا بورڈ دیکھ کر بہت سی ماؤں کا جی خالص شہد لینے کو مچل گیا اور کچھ پس وپیش کے بعد قافلے نے۔۔۔ یہاں پڑاؤ کر ہی لیا۔

اس وسیع وعریض ہنی بی فارم میں چاروں طرف پھول ہی پھول دکھائی دیتے تھے۔ ان رنگا رنگ پھولوں کو دیکھ کے میں نے سوچا۔۔۔ کیمرون ہائی لینڈز کو سچ ہی ایشیاء کا سوئیزر لینڈ کہا گیا ہے۔ یہاں خوبصورت پھولوں کی بہاریں تھیں اور۔۔۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رکھے گئے رنگا رنگ ڈبوں کی قطاریں تھیں جن میں۔۔۔ شہد کی مکھیاں۔۔۔ شہد بنانے کے عمل

میں مصروف تھیں ۔رنگوں کی اس بہار میں مکھیاں رس کشید کرنے اور شہد بنانے میں مگن تھیں ۔یہ تو مُقیّد مکھیاں تھیں اور ۔۔۔۔منظم طریقے سے شہد کے چھتے بن رہی تھیں ۔میں نے تو اپنے بچپن میں آزاد اڑتی ہوئی شہد کی مکھیوں کو بھی اسی لگن سے ۔۔۔۔قریہ قریہ پھولوں کو تلاشتے دیکھا اور کھیتوں کھلیانوں ۔۔۔۔باغوں ۔۔۔۔مرغزاروں میں پھولوں تک رسائی حاصل کرتے پایا تھا میں نے تو اپنے گاؤں میں چھتے سے شہد نکالنے کے مشکل ترین مرحلے کو بھی ۔۔۔۔ڈرتے ڈرتے دیکھا تھا۔

یہاں ہم نے مختلف ذائقوں کے شہد چکھے اور خریدے بھی ۔۔۔۔کچھ نے سوئینیرز بھی لئے مگر میں ۔۔۔۔صرف ان وادیوں کو دیکھتی رہی جہاں ایک طرف مکمل سکوت تھا اور دوسری طرف نیچے ان آبشاروں کا شور گونجتا تھا اور متوالا کئے جاتا تھا جو کیمرون ہائی لینڈز کے تاج میں نگینے کی طرح جڑی تھیں ۔ہم ان نگینوں تک گئے ضرور اور ایک آبشار کے اردگرد کی رونق دیکھی حُسن دیکھا، مترنم صدائیں سنیں اور قدرت کی صناعیوں کی داد دیتے ہوئے چائے کے باغ میں چلے آئے۔

بوہ۔ٹی۔گارڈن (Boh Tea Garden) چائے کے یہ باغات سطح سمندر سے تقریباً پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں ۔Boh Tea ملائیشیا میں چائے کا ایک بڑا برانڈ ہے جس کے یہاں تین بڑے فارم ہیں ۔چائے کے ان باغوں سے مقامی اور پردیسی بہت سے لوگوں کا روزگار جڑا ہوا ہے ۔یہ سب چائے کے پودے لگاتے ہیں ۔۔۔۔ان کی حفاظت کرتے ہیں اور ۔۔۔۔پتیاں لگنے تک کا انتظار کرتے ہیں ۔چائے کی پتیاں ان کو وہی خوشی دیتی ہیں جو گندم کے خوشے دیکھ کر ۔۔۔۔ہمارے کسانوں کو ملتی ہے ۔شنگھائی پلاس فارم (Sungai Palas Farm) میں چُنی گئی چائے کی پتیاں مختلف مراحل سے گزاری جا رہی تھیں ۔چائے کی بھینی بھینی مہک ۔۔۔۔فضاؤں میں اس وقت بھی رچی ہوئی تھی جو چائے کی طلب بڑھا گئی تھی اس لئے ہم

چائے پی کرتازہ دم ہونے کو کیفے میں چلے آئے۔

اس کیفے میں سیاحوں کے بیٹھنے کے لئے وسیع ہال بنایا گیا تھااور شیشے کی دیواروں سے آنے والوں کو چائے کے باغات کے نظاروں کا بندوبست بھی کیا ہوا تھا۔سامنے باہر اونچے نیچے لہریا دار۔۔۔چمکدار سرسبز پودے جی خوش کرتے تھے۔دور سے یہ رولنگ ڈھلوانیں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے قدرت نے مخمل کا سبز دوشالہ ہوا میں لہرا دیا ہو یا جیسے۔۔۔رنگریز چنریا رنگنے کے بعد اسے ہوا میں لہرا کے خشک کر رہا ہو بالکل اسی طرح۔۔۔چائے کے یہ پودے تا حد نگاہ سبز مخملیں چادر ہوا میں لہراتے دکھائی دیتے تھے اور کیفے کے اندر دیواروں پر Every Time is Tea Time کی تکرار چائے کی طلب بڑھاتی تھی۔

کیفے میں ہمارے آس پاس۔۔۔مختلف میزوں پر مختلف چائے کے ذائقوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ہم تو بچپن سے اب تک ڈبوں میں پیک چائے کے ذائقے سے مانوس تھے۔چائے کا اصل مطلب تو صحیح معنوں میں اس تازہ اور خالص ذائقے نے سمجھایا تھا۔سونے پہ سہاگے کا کام رہیں۔۔۔ناسی لیمک چیز کیک اور اسٹرابری کیک نے کر دیا تھا۔کچھ دیر ہم نے چائے کے پودوں کی سنگت میں وقت گزارا۔جی بھر کے اس مہک کو محسوس کیا۔۔۔کچھ وقت فوٹو گرافی کی نذر کیا۔اس ٹی گارڈن سے نکلنے سے پہلے یہاں لڑکیاں پھر شاپنگ میں مصروف ہو گئیں اور شوہر بے چارے۔۔۔جلدی واپسی کے ہنکارے بھرنے لگے۔

دن تقریباً ڈھلنے کو تھا۔رِکن مِن بھی شروع ہو گئی تھی۔میں نے اک اداسی کی سی کیفیت میں اس مخملیں وادی پہ الوداعی نظر ڈالی اور قدم گاڑی کی طرف بڑھا دیے۔پھوار خاصی تیز ہو گئی تھی۔لمحہ بھر کو رک کے میں نے پھر ان پہاڑوں کو دیکھا۔برستے موسم کی شوخ بوندوں نے ان پہاڑوں کے لالہ رو کناروں کو سلگا دیا تھا۔

میں نے سوچا! کتنا حسن بخشا ہے قدرت نے اس دیس کو۔۔۔

یہ دیس تو بہتے جھرنوں۔۔۔۔ گنگناتی آبشاروں۔۔۔۔ ساگر کی پرسکون لہروں ۔۔۔۔خوبصورت جزیروں۔۔۔۔ بھیگے بھیگے ساحلوں اور ٹھنڈے میٹھے پانیوں جیسی نعمتوں سے بھرا پڑا ہے۔ فطرت کے ہزار ہا حسین ودلنشین رنگ یہاں بکھرے ہوئے ہیں۔

یہ رنگ ہریالی وزرخیزی کے رنگ ہیں۔

ترقی وجدت کے رنگ ہیں۔ ان سب رنگوں کی اپنی ہی الکھ نگری ہے۔

بارش موسلا دھار ہونے لگی تھی جیسے ہمیں روکنے کے درپے ہو مگر۔۔۔۔

کون رکتا ہے کسی کے روکے؟

اداسی کی اک لہر تھی جو رگ وپے میں اتر گئی۔ واپسی کا سفر شروع ہو گیا تھا۔ رات کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ رستے صاف تھے۔ سڑکیں ہموار تھیں۔ گاڑیاں سبک خرام تھیں اور رستے میں رونقیں آباد تھیں۔ رات کے اترنے اور بارش کے برسنے کا بھی ان پہ کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ تیزی سے اترتی رات اور چھم چھم برستی برسات میں بھی یہاں خواتین بے خوف وخطر سڑک کنارے دکانداری کر رہی تھیں۔ سارنگ پہنے، سر پہ اسکارف باندھے کھردری جلد اور نرم لہجے کے ساتھ ۔۔۔۔اشیائے خورد ونوش بیچتی۔۔۔۔ اشاروں سے غیر ملکیوں سے بھاؤ تاؤ کرتی یہ عورتیں اپنے دیس کا مان ہیں۔

یہاں کوئی انہیں ہراساں نہیں کرتا۔ ملائیشیا میں نوے فیصد عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ گھر اور ملک دونوں کی آسودگی کے لئے بڑے بڑے دفتروں سے لے کر چھوٹے چھابوں تک براجمان یہ عورتیں۔۔۔۔ اپنی حد میں رہتی ہیں۔ آپے سے باہر نہیں ہوتیں۔ جو کماتی ہیں وہ سارے کا سارا اپنے بناؤ سنگھار پر نہیں لگا دیتیں۔ فیشن کی اندھا دھن تقلید نہیں کرتیں۔

ملائیشیا میں چونکہ قانون پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی عورت خود

کو محفوظ تصور کرتی ہے۔ کام تو ہمارے ہاں کی عورت بھی کرتی ہے۔ ہر طبقے اور ہر کلاس کی عورت کرتی ہے مگر صورتِ حال کچھ مختلف ہے۔ ایک تو ہمارے بہت سے گھروں میں اب بھی لڑکیوں کی زیادہ تعلیم کا رواج نہیں۔ میٹرک، ایف اے کے بعد تعلیمی سلسلہ ختم کرا دیا جاتا ہے۔ کچھ لڑکیاں ملازمت کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی ہیں اور ---- دفتروں سکولوں میں ملازمت کرنے لگتی ہیں۔ گھر میں فارغ رہ کر رشتے کا انتظار کرنے کی بجائے کم تنخواہ پر بھی زندگی کی دوڑ میں شامل ہو جاتی ہیں۔ یہ بچیاں جتنا کماتی ہیں اتنا ہی اپنی ٹیپ ٹاپ پہ لگا دیتی ہیں کہ ---- سادگی اب ہمارا شعار ہی نہیں رہا۔ دن بھر مغز کھپائی کے بعد تھکن ان کی رگوں میں اترتی ضرور ہے مگر اپنی پہچان بنانے کی خوشی اس تھکن پر غالب آ جاتی ہے۔

دوسرے ہمارے ہاں عورتوں کو ہراساں کرنے کی عادت ان کے بڑھتے قدم روک دیتی ہے۔

مجھے یاد ہے۔ جب میں کرشن نگر سے اے جی ایچ ایس گلبرگ جایا کرتی تھی اور واپسی پر جب اندھیرا پھیلنے لگتا تو تین بڑے بچوں کی ماں ہو کر بھی میں خوفزدہ ہو جایا کرتی تھی۔ میرے دیس کے جیالے بس سٹاپ پر کھڑا ہونا عذاب بنا دیتے تھے۔ موٹر سائیکل سوار آس پاس منڈلاتے رہتے تھے۔ کچھ موٹر کار کے ہارن بجا کر اپنی طرف متوجہ کرنے والے بوڑھے اور کچھ جوان اوباش ---- ایک محنتی اور ملازمت کرنے والی ماں کو کمزور کرنے کی سرتوڑ کوششیں کرتے تھے۔ کبھی جب بس کے طویل انتظار میں پاؤں کی اینٹھن واویلا کرنے لگتی تو دوسرے ہی لمحے ---- عزم و حوصلہ اپنا پرچم بلند کر دیتا اور میری آنکھیں دوبارہ سے بس کے انتظار میں بچھ جاتی تھیں۔

مردوں کے اس معاشرے میں ایک خوددار اور اصول پرست عورت کو سر اُٹھا کر جینے کی بہت قیمت چکانا پڑتی ہے۔ اس کے رستے بند کر دیے جاتے ہیں۔ اسے آگے بڑھنے کا موقع

نہیں دیا جاتا مگر صد شکر۔۔۔میں نے حوصلہ ہارا اور۔۔۔نہ ہی اپنے اصول توڑے۔البتہ ایک چھوٹے اور پرسکون سے شہر کی رہنے والی اس عورت نے لاہور جیسے بڑے شہر میں قدم جمانے اور اپنا رستہ بنانے کے لیے بہت تگ ودو کی تھی۔

ہٹلر ماں کے متزلزل ارادے

ہماری تین رکنی کابینہ بہت دیر سے سر جوڑے بیٹھی تھی مگر مسئلہ حل نہیں ہو رہا تھا۔

مسئلہ حل ہوتا بھی کیسے؟ میں تو اپنا ارادہ بدلنے کو قطعاً تیار نہ تھی کہ۔۔۔

بیس پچیس دن بہت ہوتے ہیں سیر سپاٹوں کے لئے اور میں تیرہ ریاستوں والے اس ملک میں۔۔۔ ممکنہ حد تک گھوم پھر چکی تھی۔ دریا، سمندر، جنگل، پہاڑ، بارشیں، دھوپ، سب کچھ ہی دیکھ لیا تھا۔ اب جو واپسی کے دن قریب آ رہے تھے تو بیٹی نے رانی گھن مچا دیا تھا۔ میری ہمیشہ سے یہ عادت رہی۔۔۔ جو پروگرام بنا لیا پھر اس میں رد و بدل بنا کسی مجبوری کے کبھی کیا ہی نہیں حتیٰ کہ میکے سے واپسی (جو لڑکیوں کو بہت شاق گزرتی ہے) بھی طے شدہ پروگرام پہ ہوتی تھی۔ اس بچے رکنا چاہتے۔ بچوں کو اداس دیکھ کر امی جان ایک آدھ دن اور رک جانے کا کہتیں تو بچے خالاؤں۔۔۔ سے چپک کر میرے ارادے کے ڈانواڈول ہونے کی دعائیں مانگنے لگتے مگر۔۔۔ ایک ہٹلر ماں ہر اصرار سے صرفِ نظر کرتی ہوئی اپنے پروگرام کے مطابق واپسی کرتی ۔۔۔۔

بات اب بھی وہی تھی۔

فرق تھا تو صرف اتنا کہ۔۔۔ پہلے میری ماں مجھے مزید کچھ دن اور رکنے کا کہا کرتی تھی جسے میں۔۔۔ پھر آنے کا کہہ کر ٹال دیا کرتی تھی اور اب میری بیٹی مجھے کچھ دن اور رک

جانے پہ اصرار کر رہی تھی۔ جسے پھر آنے کا کہہ کر ٹالنا میرے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ ابھی تک تو میں اپنے فیصلے پر ڈٹی ہوئی تھی مگر۔۔۔۔ میری بیٹی کے ٹپ ٹپ گرتے آنسو میرے ارادے کو متزلزل کرنے پہ تلے تھے۔ اب میں جان گئی تھی کہ اولاد کی ضد کے آگے ماں باپ کی زندگی کے سارے اصول۔۔۔۔ سارے قاعدے اور ضابطے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

اولاد کے آنسو۔۔۔۔ ماں باپ کی سوچ کے دھارے بدل دیتے ہیں۔

یہ بات بھی اب سمجھ میں آ گئی تھی کہ بڑے سے بڑا اصول پرست بھی کیسے۔۔۔۔ اولاد کے سامنے کٹھ پتلی بن جاتا ہے۔ میں بھی اس وقت کٹھ پتلی بن گئی تھی۔ میرے بدلے ہوئے ارادے نے میرے بچوں کو خوش کر دیا تھا اور اسی خوشی میں وہ۔۔۔۔ مجھے پسار مالم مارکیٹ لے آئے تھے۔

ملائیشیا میں کہیں بھی چلے جائیں یہ پسار مالم مارکیٹ ضرور ملتی ہے۔ اس مارکیٹ میں لوگ رات کو سڑک کنارے سٹال لگا لیتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی گاڑیوں میں سٹال لگائے کاروبار کرتے ہیں۔ اس پسار مالم مارکیٹ میں ضرورت کی ہر چیز دستیاب تھی۔ ان سٹالز پر زیادہ تر عورتیں نظر آ رہی تھیں۔ چینی اور ملئے عورتیں۔۔۔۔ اپنے اپنے قومی لباس میں ملبوس سامان بیچتے ہوئے۔۔۔۔ غیر ملکیوں سے اشاروں میں بھاؤ تاؤ کرتی ہوئی مجھے بہت اچھی لگیں۔ کچھ کی گود میں بچے بھی دکھائی دے رہے تھے۔

دل ہی دل میں ان کی عظمت کو سراہتے ہوئے میں نے سوچا!

عورت کسی دیس میں رہتی ہو۔۔۔۔ کسی مذہب سے تعلق رکھتی ہو۔۔۔۔ کوئی سی بولی بولتی ہو۔۔۔۔ گھر کو گھر بنانے کے لیے محنت، ایثار اور قربانی کا جذبہ سب میں ایک سا ہوتا ہے۔

بچے ضرورت کی چیزیں خریدتے رہے اور میں ان محنتی عورتوں کو دیکھتی رہی جو رات گئے تک۔۔۔۔ بے خوف و خطر اپنی بہتر زندگی کے لئے کوشاں تھیں۔ پھر میں نے ایک نظر

خریداروں کے ہجوم پر بھی ڈالی۔

ہمارے ہاں کے اتوار بازار جیسا سماں تھا مگر۔۔۔۔۔ہلڑ بازی نہیں تھی۔یہاں سب اپنے جذبوں کو لگام ڈالے خریداری کر رہے تھے۔چینی عورتوں کی ننگی ٹانگیں اور کھلے گریبان یہاں کسی کے ایمان کو متزلزل نہیں کر رہے تھے۔یہی اس دیس کی کامیابی تھی اور یہی اس دیس کی عورتوں کی کامیابی تھی۔

نیا دن نئے پروگرام لئے طلوع ہوا تھا۔جس میں سرِ فہرست تو ویزے میں توسیع کرانا تھا۔جانے میں تو کئی دن تھے اور میں پہلے سے ہی۔۔۔۔اپنا سامان باندھ بیٹھی تھی۔اب جو یہ رُکنے کا شوشہ چھوڑا گیا تو میں متحرک ہوگئی۔سب سیر و تفریح بُھلا بیٹھی کہ۔۔۔۔پہلے مُہر اجازت ثبت ہو جائے اور اگر کسی وجہ سے نہ ہو سکے تو بنا کسی مشکل میں پڑے۔۔۔۔اپنے دیس کی راہ لی جائے۔اب تک میں ان بکھیڑوں سے مُبرّا رہی تھی۔اس لئے کچھ خوف سا دل میں جگہ بنانے لگا تھا۔

پہلے کب ہوتے تھے یہ ویزے پاسپورٹ میں نے دل میں کہا۔

ابنِ بطوطہ نے ویزہ لیا نہ پاسپورٹ۔۔۔۔دشوار گزار رستوں پہ سفر کرتا ہوا تین براعظموں میں گھوم پھر کے واپس لوٹ گیا۔مارکو پولو نے وینس سے چین تک کا سفر۔۔۔۔بنا کسی پاسپورٹ ویزے کے ہی کر ڈالا۔سرحدیں تو تب بھی ہوا کرتی تھیں مگر پرانے وقتوں میں آنے جانے پہ کوئی پابندی نہیں تھی۔یہ تو خیر۔۔۔۔بہت ہی پرانی بات ہے۔اس پام نگری میں بھی کچھ برس پہلے تک لوگ بغیر ویزے کے آیا کرتے تھے۔جب جی چاہا۔۔۔۔ رختِ سفر باندھا۔۔۔۔ٹکٹ خریدا اور ملائیشیا کی پامی فضاؤں میں آ پہنچے۔تب ویزہ ملائیشیا ایئر پورٹ پہ پہنچ کے لگا دیا جاتا تھا مگر۔۔۔۔جب سے آنے والوں نے دو نمبریاں شروع کیں اور سیر و سیاحت کی آڑ میں ملائیشیا آنے اور پھر واپس نہ جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ملائیشین گورنمنٹ نے ویزے کی

پابندی عائد کردی اور پھر۔۔۔۔ یہ پابندیاں ہم سب پہ بھی لاگو ہو گئیں۔

امیگریشن دفتر کی عمارت خوبصورت اور صاف ستھری تھی۔ جو ہری بھی تھی اور بھری بھی کہ۔۔۔۔ مختلف ملکوں سے آئے لوگ اس سرسبز ملک میں کچھ دن اور قیام کی خواہش لئے ہوئے تھے۔ یہاں رش تو تھا مگر بے ہنگم نہیں۔ الگ الگ ملک کی۔۔۔۔ الگ الگ قطار لگی ہوئی تھی۔ ٹوکن پکڑو اور باری کا انتظار کرو۔ کاؤنٹرز پہ ملئے خواتین براجمان تھیں۔ میں بھی قطار میں کھڑی ہو گئی۔ نیوی بلیو یونیفارم اور نیوی بلیو اسکارف میں ملبوس۔۔۔۔ عام سے چہرے والی لڑکی نے پھیکی سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا، کاغذات مجھ سے لئے۔۔۔۔ کمپیوٹرز پہ نظریں جمائے کچھ کھوجتی رہی اور پھر۔۔۔۔ پندرہ دن آگے کی تاریخ پہ مہر اجازت لگا دی۔ میں نے اک لمبا سانس لیا اور کاؤنٹر سے ہٹ گئی۔ سر سے جیسے منوں بوجھ اُتر گیا تھا۔

بیٹی اور داماد نے بڑے فخریہ انداز میں مجھے دیکھا گویا!

باور کرا رہے ہوں کہ۔۔۔۔ دیکھا کبھی کبھی ارادے بدلنے بھی پڑتے ہیں۔

ٹھنڈی ٹھار عمارت سے پارکنگ تک جانا کسی عذاب سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ کڑی دوپہر تھی۔ ایک بج رہا تھا تیز دھوپ بدن میں سوئیاں چبھونے لگی تھی۔ افضال نے گاڑی گھمائی اور لمبے روٹ پہ ڈال دی۔ تقریباً پینتالیس منٹ کے بعد ہم ریاست پیراک کے دو قصبوں لومٹ (LUMUT) اور سلی وان (SILIWAN) کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے ساحل سمندر پہ آ پہنچے۔ ہم جب تالک باتک بیچ (TELUK BATIK BEACH) کی طرف چلے تو سورج۔۔۔۔ سوا نیزے پر تھا۔ یہ ایک خوبصورت تفریحی مقام تھا جس کے کنارے کنارے ناریل، ربڑ اور دوسرے بہت سے درخت۔۔۔۔ اس گرم خطے کی چلچلاتی دھوپ پہ اپنی گھنی چھاؤں کئے ہوئے تھے۔ دور تک سیاہ چمکدار بڑی چٹانوں کے ستون قدرتی چڑھائیاں چڑھتے ہوئے۔۔۔۔ افق کی جانب بڑھتے ہوئے، آخری سرے پر جنگل سے بغلگیر ہوتے دکھائی دیتے

تھے۔نظر کی آخری حدوں تک مچلتا ہوا پانی۔۔۔لہروں کی بے تابی کی داستاں سناتا تھا اور ناریل کے درختوں سے نکلتی بندروں کی فوج ظفر موج، اُچھل کود کرتی ہوئی پاس سے گزرتی تھی۔تیز دھوپ۔۔۔سمندر کے نیلگوں پانی کو اپنی تمازت سے حرارت بخشتی تھی اور نرم سفید بھر بھری ریت۔۔۔روح تک ٹھنڈک اتارتی جاتی تھی۔

اُف! بہت خوبصورت نظارا تھا۔

ریاست پیراک کے تمام ساحلوں میں سب سے خوبصورت ساحل

تالک باتک ساحلِ سمندر جہاں۔۔۔مقامی لوگ اکثر اپنی شامیں گزارتے ہیں اور پانی کی اٹھکیلیاں دیکھ کے محظوظ ہوتے ہیں۔

ساحل کی مڑتی بل کھاتی پٹی دور تک ہرے بھرے درختوں سے لپٹی نظر آتی تھی۔ان درختوں کے عکس نے سمندر کے نیلے پانی پہ بھی اپنا ہرا رنگ بکھیر دیا تھا۔قدرتی چٹانوں سے سبز دھوئیں کے مرغولے سے اٹھتے دکھائی دیتے تھے جو۔۔۔ماحول کو ہرا بھرا کر جاتے تھے۔کڑی دوپہر میں سمندر کے بیچوں بیچ سورج کی نارنجی کرنوں نے پانی کو سونے کے رنگ جیسا بنا دیا تھا۔قدرت کی ان صناعیوں پہ فدا ہونے کو جی چاہتا تھا۔خوشحالی اور ہریالی والے اس دیس میں چہار سو خوبصورتیاں تھیں۔۔۔رنگینیاں تھیں۔تالک باتک کے ساحل (TELUK BATIK BEACH) پہ اس وقت رنگا رنگ ہجوم تھا۔بچے بوڑھے اور جوان سب کے سب پانی سے سرمستیاں کر رہے تھے۔کنارے پہ ایک طرف کشتیوں کی لائن تھی۔کچھ لوگ اس وقت بوٹنگ کر رہے تھے۔اور کچھ ان پر ہوٹنگ کر رہے تھے۔پانی کی دیوانگی دیکھنے والوں کو مسحور کئے ہوئے تھی۔لہریں مچلتی ہوئی دوڑتی ہوئی آتیں۔۔۔چھینٹے اڑاتیں اور پھر پلٹ جاتیں۔میں لہروں کی بے تابی کو دیکھ رہی تھی کہ۔۔۔شیو کمار بٹالوی کے گیت کی گونج سنائی دینے لگی۔

مائے نی مائے! میرے گیتاں دے نیناں وچ برہوں دی رڑک پوے

ادھی ادھی راتیں اٹھ روں موئے متراں نوں مائے سانوں نیندنہ پوے

میں نے آواز کی سمت نظر دوڑائی ۔ چہرے پہ ہیٹ دھرے ۔۔۔۔ من میں درد سمیٹے ۔۔۔۔ کچھ ہی فاصلے پہ اک دکھیارا سکھ نوجوان نرم بھر بھری ریت پہ لیٹا ۔۔۔۔ یہ گیت با آواز سن رہا تھا اور اپنے ساتھ ساتھ اوروں کو بھی دُکھی کرنے پہ تُلا تھا۔ میں نے اس نوجوان کی طرف سے اپنی توجہ ہٹائی اور پہلے تو ان من موجی لہروں سے اُلجھی تن من بھگوتی رہی پھر ۔۔۔۔ پانی پہ چلنے کی کوشش کرتے ہوئے تھوڑا آگے بڑھی مگر۔۔۔۔ رک گئی ۔

وقت ہمیں کتنا بدل دیتا ہے۔ میں نے سوچا۔

چالیس سال پہلے کے کلفٹن کی سیر کے منظر میری آنکھوں میں آ بسے۔

تب گہرے پانیوں سے کب ڈر لگتا تھا؟ ہم بڑے دلیر ہوا کرتے تھے۔ مچلتی لہروں کے ساتھ مچلتے ہوئے دور تک پانی میں بھاگتے جاتے تھے اور جب یہ مضطرب لہریں ہمیں دھکیلتی ہوئی واپس ساحل پر پٹخ دیتیں تو اس بے رخی پہ دکھی ہونے کی بجائے ہم خود پہ ہنسنے لگتے تھے پھر دیر تک ہماری مشترکہ ہنسی کے جلترنگ ۔۔۔ سمندری فضاؤں اور ساحلی ہواؤں میں بجتے رہتے تھے۔

افضال بہت دیر سے پانی میں سرمستیاں کر رہے تھے اور ارم تعبیر کو سنبھالے ہوئے تھی۔ وہ واپس آئے تو ارم نے تعبیر ان کے حوالے کی اور میرا ہاتھ پکڑ کے ۔۔۔ سنبھل سنبھل کر ریت پہ پیر جماتی پانی کی طرف بڑھنے لگی۔ افضال تصویریں بناتے رہے اور ہم پوز بناتے رہے۔ ارم واپس پلٹی تو میں نے دیکھا سورج بھی واپسی کا ارادہ کیئے ہوئے تھا۔ سورج کی جلالی کرنوں نے جس پانی کو پہلے زعفرانی بنا رکھا تھا اب وہ ارغوانی سا ہو گیا تھا۔ پانی میں ٹھنڈک بڑھی تو میں اور ارم ۔۔۔ وہاں چلے آئے جہاں ٹوائلٹ ۔۔۔ شاور اور کپڑے تبدیل کرنے کا انتظام تھا۔ بہت سی خواتین کاسٹیوم لئے اپنی باری کی منتظر تھیں۔ ہم نے بھی کپڑے تبدیل کیئے

۔۔۔حلیہ درست کر کے باہر نکلے تو۔۔۔۔قریب کھڑی ناریل بیچتی لڑکیوں نے رستہ روک لیا۔ ہراک کی یہی خواہش کہ۔۔۔۔خریداری اس سے کی جائے۔ ناریل پانی پی کر ہم افضال کی طرف چلے آئے۔ جہاں پانی کا شور مدھم پڑ گیا تھا اور سمندر کی نیلاہٹ اب سیاہی مائل دکھنے لگی تھی کہ دھوپ جاتے ہوئے۔۔۔۔چمکیلے نظارے بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

میں نے دیکھا!

ایک جگہ لوگوں کا ہجوم آسمان کی طرف منہ اٹھائے کھڑا تھا۔ سب کی نظریں اسی رنگین کھیل تماشے پہ لگی تھیں جو۔۔۔۔فضاؤں میں بکھرا ہوا تھا۔ ساحل کی خاموش فضا میں اجنبی زبان میں گائے گئے گیت گونج رہے تھے اور اوپر خلا میں۔۔۔۔مختلف رنگوں کی تصویریں نظر آ رہی تھیں۔ لیزر کے ذریعے یہ دلکش رنگین تصویریں کبھی بنتی اور کبھی مٹتی دکھائی دے رہی تھیں۔ پانی اور آگ کے فوارے نہایت دلفریب رنگوں میں جب خلا میں اپنا کمال دکھاتے تو اک معصوم صورت لڑکی۔۔۔۔اسی کمال مہارت سے اس آگ اور پانی کے کھیل سے اپنا دامن بچاتے ہوئے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی۔ اس کی کامیابی پہ ساحل سمندر پہ دیر تک تالیوں کی گونج سنائی دیتی رہتی۔ تالیوں کا یہ شور گیت گانے والوں کی آواز پہ غالب آ جاتا تھا مگر۔۔۔۔۔کچھ ہی دیر میں یہ لَے پھر تیز ہونے لگتی تھی۔

لیزر سے رقص کرتے فوارے۔۔۔۔رنگین تصویروں اور آتش بازی سے کہانی بنتے کرداروں کو۔۔۔۔فضا میں گیتوں کی لے پہ بکھرتا ہوا یہ شو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ مقامی لوگوں کو تو اس کہانی سے شُدھ بدھ ہو گی مگر ہم تو یہ۔۔۔۔رنگین، دلآویز، آتش بازی سے بنتی مٹتی تصویروں کو دیکھ کے جی خوش کرتے رہے۔ میں نے دیکھا۔ دن کی نسبت اس وقت یہاں پر لوگوں کی تعداد کافی زیادہ ہو گئی تھی۔ بہت سے لوگ شاید لیزر شو دیکھنے کے لیے ہی یہاں آئے ہوئے تھے۔ لیزر شو ختم ہوا تو ہجوم ٹولیوں میں بٹ گیا۔ کچھ منچلے فشنگ کرنے لگے۔ مقامی لوگوں

کی ایک ٹولی باآواز بلند ملّے گیت گانے لگی تھی۔ شوقین مزاج اپنے شوق پورے کرنے کو یہاں رُکے ہوئے تھے جب کہ فیملیاں ۔۔۔۔ آہستہ آہستہ گھروں کا رُخ کرنے لگی تھیں اور دن میں حشر اٹھاتا ۔۔۔۔ شور مچاتا سمندر بھی اب چپ کی چادر اوڑھے ۔۔۔۔ کبھی آسمان پہ بکھرے تاروں کو اور کبھی جانے والوں کو خاموش نگاہوں سے تک رہا تھا۔

ہم بھی اپنا سامان سمیٹے تاریکی میں ڈوبے سمندر کو خدا حافظ کہتے ہوئے باہر کی طرف چل دیے جہاں رستے میں بہت سے سٹال رنگین قمقموں سے سجے ہوئے تھے اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے تھے۔ ان سٹالز پر مقامی سوغاتیں، سوینیئرز، تالک باتک کے مونو گرام والی شرٹس، کیپ، ہیٹ اور موجود تھے۔ لوگ یہاں سے خریداری ایک فریضہ سمجھ کے کر رہے تھے اور میں یہ سب دیکھتے ہوئے ۔۔۔۔ ان پہ طائرانہ نظر ڈال کے آگے بڑھ رہی تھی کہ زیادہ سامان دورانِ سفر مجھے پسند ہی نہیں۔ کھانے پینے کے بھی بہت سے سٹال موجود تھے مگر ہم ۔۔۔۔ ان سب سے نظر چرا کے ہائی وے پہ چلے آئے تھے جہاں رستے میں سڑک کنارے بنے (LEE RESTURANT) لی ریستوران کی تیار کردہ سالم فش سے پیٹ پوجا کرنا تھی۔

ریستوران چھوٹا تھا مگر بہت صاف ستھرا تھا۔

چینی سٹاف بڑی مستعدی سے آنے والوں کو خوش آمدید کہتا تھا اور ۔۔۔۔ اپنی معیت میں ٹیبل تک پہنچاتا تھا۔ سالم فش کی دعوت میری طرف سے تھی۔ یہاں زیادہ تر لوگ سالم فش سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جب یہ ڈش ہم تک آئی تو اندازہ ہوا کہ ۔۔۔۔ تعریفیں کچھ بے جا نہیں تھیں۔ ایک بڑے سائز کی مچھلی جس کے ساتھ ۔۔۔۔ مختلف ذائقہ دار چٹنیاں بھی تھیں ، نہایت سجاوٹ کے ساتھ ہمیں پیش کی گئی تھی۔ باوجود بہت مزیدار ہونے کے ہم تین لوگ یہ سالم فش ختم نہ کر سکے تھے۔ مقدار اور ذائقہ دونوں ہی لاجواب تھے۔ سیر ہو کر کھائی اور پھر لیمن ٹی ود آئس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے رات گئے اک یادگار دن گزار کے اس اطمینان کے ساتھ

گھر لوٹے کہ

مزید پندرہ دن اس شاداب ملک میں قیام کی منظوری مل گئی ہے۔اب ملاکا دیکھنا نا ممکن نہیں رہا۔

ملائیشیا کا وینس ۔۔۔ ملاکا

بچوں نے تو کوالالمپور جانا ہی تھا کہ ۔۔۔

KLCC میں منعقدہ ایک کانفرنس میں افضال نے ریسرچ پیپر پیش کرنا تھا مگر میرا ان کے ساتھ یہاں چلے آنا ویزے کی توسیع نے ممکن بنا دیا تھا۔ سو جھٹ پٹ توسیعی پروگرام بنا اور ۔۔۔ اس پروگرام کو عملی جامہ پہناتے ہوئے تاروں کی چھاؤں میں ہم کوالالمپور پہنچ گئے تھے مگر ۔۔۔ ہوٹل میں چیک اِن کرنے کے بعد اس شہرِ گل رنگ کی رنگینیاں سمیٹنے کی بجائے لمبی تان کے سو گئے تھے تا کہ خوب تازہ دم ہو جائیں اور ۔۔۔ جونہی افضال کنونشن سینٹر سے واپس آئیں، ہم ملائیشیا کی اس ساحلی ریاست کو نکل جائیں جسے ۔۔۔ قدرت کا حسین کرشمہ کہا جاتا ہے۔

ملاکا ۔۔۔ جو آبنائے ملاکا کا گیٹ وے ہے۔ جو دنیا کی اہم ترین آبی گزرگاہ کا داخلی دروازہ ہے۔ دنیا بھر کی تجارت کا مرکز واحد آبی راستہ ہے جس کا پانی دو سمندروں کو ملاتا ہے اور جو آبنائے ملاکا کہلاتا ہے۔

سورج سوا نیزے پہ تھا جب ہم شوقِ سیاحت کے مارے اس سفر پہ چل دیے تھے۔ کوالالمپور سے ملاکا تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ سڑک دورویہ تھی۔ جس کے بیچ ایک لمبی گرین بیلٹ ہمارے ساتھ ساتھ چلتی جاتی تھی اور ۔۔۔ اس پہ کھِلے رنگا رنگ پھول جون کی اس

سڑی ہوئی گرمی میں بھی ۔۔۔۔ بہاروں کی نوید دیتے تھے۔ رستے میں جگہ جگہ تیر کے نشان والے بورڈ ہماری رہنمائی کرتے تھے اور ۔۔۔۔ گاڑی ہائی وے پہ دوڑتی جاتی تھی کہ گاڑیوں کی بہتات کے باوجود یہاں ٹریفک بے ہنگم نہ ہونے پاتی تھی۔ راہ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ آباد کئی چھوٹے شہر ۔۔۔۔ اس دیس کے مضافاتی علاقوں کی جھلک دکھاتے تھے بالکل اسی طرح جیسے لاہور سے ساہیوال کے درمیان بائی پاس نہ ہونے کی وجہ سے جی ٹی روڈ سے گزرتے ہوئے کبھی بہت سے شہر دکھائی دیتے تھے۔

کوالالمپور اور ملایا کے رستے میں گھنے جنگلات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ دکھائی دیتا تھا۔ گام گام بڑے بڑے پام اپنے پنکھ ہلاتے تھے اور دور تک قطار در قطار ربڑ کے درخت سر جوڑے سرگوشیاں کرتے نظر آتے تھے۔ ربڑ کے ان درختوں کے تنوں کی گردنوں میں جگہ جگہ ہانڈیاں جھولتی تھیں ۔۔۔۔ ان تنوں میں کئے گئے سوراخ سے گاڑھا محلول نکلتا تھا اور ۔۔۔۔ ان ہانڈیوں کا دامن بھرتا جاتا تھا جو بعد میں ۔۔۔۔ ربڑ بن جاتا تھا۔ ربڑ کی کاشت نے بھی ملائیشیا کی اکانومی کو خاصا مضبوط کر رکھا تھا۔ تین گھنٹے کی مسافت کے بعد ہمیں اپنی منزل کے آثار دکھائی دینے لگے تھے اور ہم ملاکا پہنچ گئے تھے۔

ملاکا ۔۔۔۔ ایک قدیم، تاریخی اور تہذیبی شہر ہے جو کبھی مچھیروں کی بستی ہوا کرتا تھا۔ ملایا۔ وہ شہر ہے جو دریائے ملاکا کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ جہاں قدیم اور جدید کا امتزاج ہے اور 2008ء میں یونیسکو نے جسے عالمی ثقافتی ورثہ قرار دے دیا ہے۔

اس شہر نے گزشتہ سات ۔۔۔۔ آٹھ صدیوں میں حکمرانی کے بہت سے بدلتے رنگ دیکھے ۔۔۔۔ تجارت کے نئے نئے ڈھنگ دیکھے اور مختلف قوموں اور تہذیبوں کے مچلتے ہوئے انگ بھی دیکھے۔ ملاکا میں اس وقت تیز دھوپ کی چادر تنی تھی مگر ۔۔۔۔ ٹھنڈی ہواؤں کے نٹ کھٹ جھونکے اس دھوپ کی تیزی کو بے اثر کئے ہوئے تھے کہ بحر ہند اور بحر اوقیانوس کے

درمیان ۔۔۔۔آبی رستے پہ وہ تجارتی بندرگاہ یہاں سے قریب ہی تھی جہاں بڑے بڑے تجارتی بحری جہاز چین ۔۔۔۔جاپان اور بحرالکاہل کے اہم ملکوں کا تجارتی سامان ہندوستان ۔۔۔۔مشرق وسطیٰ اور یورپ وافریقہ کے ملکوں تک پہنچاتے تھے۔ چین اور ہندوستان سے یکساں فاصلے پر واقع ملائیشیا ۔۔۔۔تب تجارتی سامان کی آمدورفت کا اہم مرکز ہوا کرتا تھا۔ عرصۂ دراز سے چینی اور ہندوستانی ۔۔۔۔ملاکا کی بندرگاہ پر ریشم کے پارچہ جات ۔۔۔۔چائے ۔۔۔۔گرم مصالحے اور خشک میوہ جات فروخت کرتے اور اس کے بدلے میں یہاں سے مختلف دھاتیں اپنے اپنے دیس لے جایا کرتے تھے۔

خیر یہ تو بہت پرانی بات ہے تب ۔۔۔۔ذرائع آمدورفت اتنے آسان کب ہوا کرتے تھے؟

ایک اونچی پہاڑی پہ کھڑے ہوئے آبنائے ملاکا کا نظارا کرتے ہوئے میں نے تاریخ میں جھانکا۔

جب کئی صدیاں پہلے مارکو پولو انہی سمندروں کی یخ بستہ طوفانی ہواؤں کو جھیلتا ۔۔۔۔خطروں سے کھیلتا بحر ہند میں داخل ہوا تھا۔ خوف سے مجھے جھرجھری آ گئی۔

کتنا نڈر ہوتا ہے انسان؟ میں نے سوچا۔ اپنے شوق کی خاطر خطروں سے کھیلتا ہے اور کائنات کے راز تلاشتا پھرتا ہے۔

یہ شوق ہی تو تھا جس نے وینس کے ایک چھوٹے سے دکاندار کے دل میں ۔۔۔۔سیاحت کی آتش شوق بھڑکا دی تھی۔ مارکو پولو کا باپ نکولو پولو اور چچا میفیو پولو جب نو برس کا تجارتی بن بانس کاٹ کے واپس اٹلی آئے اور اپنے سفر کی دلچسپ اور ہولناک داستانیں سنائیں تو اس کا جی بھی ۔۔۔۔مچل اٹھا اور اگلے سفر میں وہ ان کے ہمراہ ہولیا۔ اٹلی کے شہر وینس کا یہ سیاح ۔۔۔۔سترہ برس تک چین کے بادشاہ قبلائی خاں کے دربار سے منسلک رہا ۔۔۔۔اس کا مشیرِ

خاص بنا اور بادشاہ کی عنایتوں سے ثمر بار ہوتا رہا مگر جب۔۔۔گھر کی یاد ستانے لگی تو دربار کی یہ سب رونقیں اور شان وشوکت۔۔۔مارکو پولو کو پھیکی لگنے لگیں اور پھر اس نے بادشاہ سے اجازت چاہی اور۔۔۔بادبانی کشتیوں کا قافلہ لئے واپس اپنے وطن چل دیا۔ چین سے آبنائے ملاکا کے ذریعے وہ بحر ہند میں داخل ہوا کہ۔۔۔۔بحر الکاہل کو بحر ہند سے ملانے کا فقط یہی ایک رستہ تھا لیکن۔۔۔طوفانی ہواؤں اور تند و تیز تھپیڑوں نے قافلے کا رخ آبنائے ملاکا کے دوسرے گیٹ وے سماٹرا کی طرف موڑ دیا جہاں مارکو پولو کو۔۔۔پانچ ماہ تک مناسب موسم کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ اس دوران کئی بار بحری قزاقوں کے ہاتھوں یہ قافلے لٹے۔۔۔کتنے ہی پیاروں کو اُسے سمندر بُرد کرنا پڑا تب کہیں وہ اٹلی پہنچا مگر۔۔۔اس وقت تک چھ سو افراد پر مشتمل قافلے میں سے اس کے ساتھ۔۔۔صرف اٹھارہ لوگ زندہ بچے تھے۔

ملائیشیا میں بادل دیوانہ وار برستے ہیں۔ ہم اس وقت برستی بارش میں آبنائے ملاکا کا نظارہ کر رہے تھے جہاں۔۔۔دور تک بے شمار کنٹینرز دکھائی دیتے تھے اور سمندر۔۔۔بارش کی دیوانہ وار برستی بوندوں کو لپک کے اپنے دامن میں چھپاتا تھا اور اپنی تشنگی مٹاتا تھا۔ ساحل کا صاف ستھرا ہونا بھی مجھے حیرت میں ڈالے جاتا تھا کہ یہاں۔۔۔ دور تک کہیں پانی اور ریت کے کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ نہ بوتلیں اور نہ خالی کین۔۔۔نہ پھلوں کے چھلکے۔۔۔نہ بسکٹ کے ریپر۔۔۔نہ بچوں کے پیمپر جب کہ۔۔۔سیاحوں کی اس وقت بھی کئی ٹولیاں یہاں موجود تھیں۔ یہ نیلگوں سمندر اور سفید چمکتی ریت دل کو طمانیت بخشتے تھے اور خوشگوار حیرت دے کر مجھے کہتے تھے کہ اپنا ملک۔۔۔اپنے ثقافتی ورثے اس طرح سنبھالے جاتے ہیں۔

ملائیشیا کی اس سب سے چھوٹی ریاست ملاکا کے دارالخلافہ کا نام بھی ملاکا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ جسے ایک دن میں بھی دیکھا جا سکتا ہے مگر۔۔۔ہمارے پاس تو دو دن تھے اور ہم سہج سہج اس شہر کو دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے ہم یہیں کچھ دیر رُکے اور آبنائے ملاکا کے

کنارے پانی پہ قدم جمائے مسجد سلیت ملاکا (Masjid Selet Melaka) دیکھنے لگے جو ۔۔۔بڑی شان سے سر اٹھائے کھڑی تھی۔ پانی پہ دھیرے دھیرے جھومتی یہ مسجد ایک مصنوعی آئس لینڈ پہ بنی ہے۔ بادلوں کے سرمئی اندھیرے میں مسجد کا سنہری مینار۔۔۔آبنائے ملاکا میں اپنا سنہری پن بکھیرے ہوئے تھا۔ دور سے یوں لگتا تھا جیسے۔۔۔ساحل پہ رنگین پرندے اپنے پر کھول رہے ہوں۔

واپس پلٹتے ہوئے میں صدیوں پرانے آبی رستے کو حیرت سے تکتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ رب کریم جب چاہے بغیر کسی منصوبے، بغیر کسی پروگرام کے ہی ہمیں اپنی مصوریوں کی دید بخش دیتا ہے۔

لب ساحل پانی پہ جھولتی اس مسجد کی زیارت کے بعد ہم واپس پلٹے تو۔۔۔رستے میں ایستادہ ایک سرخ عمارت نے ہمیں روک لیا۔ ریت اور مٹی کے ملبے سے بنا یہ ڈھائی تین سو سال پرانا چرچ تھا جسے۔۔۔بہت سنبھال کے رکھا گیا تھا۔ عمارت کے ماتھے پہ کرائسٹ چرچ ملاکا (Christ Church Malacca) لکھا تھا اور اس کے نیچے سنِ تعمیر 1753ء درج تھا مگر میری توجہ۔۔۔چرچ کی بجائے صدر دروازے پہ کھڑے خوبصورت سجاوٹ سے مزّین ان ترشواؤں کی طرف ہو گئی تھی جن میں ۔۔۔مقامی باشندے اُڑے اُڑے پھر رہے تھے۔۔۔۔ میرا دل بھی مچل گیا کہ گاڑی سے نکلوں اور اس رنگین سجے سجائے ترشوا (Trishwa) میں جا بیٹھوں مگر پھر۔۔۔اس دیوانے دل کو سمجھانا پڑا کہ اب وہ بچپن کے شوق لگانا چھوڑ و اور سنبھل کے رہو کہ۔۔۔ساتھ صرف بیٹی ہی نہیں داماد بھی ہے۔

دل میں ترشوا کی حسرت لئے ہم کرائسٹ چرچ سے چینگ ہون تنگ ٹیمپل (Cheng Hoon Tang Temple) آ گئے جہاں۔۔۔بہت سے چینی سر کو جھکائے سینے پہ ہاتھ ٹکائے اور۔۔۔ہتھیلیوں میں ٹرے دبائے عبادتی مراحل سے گزر رہے تھے۔ اس ٹیمپل کی

سجاوٹ دیدنی تھی۔ خاص طور پر خم کھائی ہوئی۔۔۔۔ سجی سجائی ہوئی اس کی چھتیں جن میں مختلف پھولوں، پرندوں، دیوتاؤں کی مورتیوں سے سجاوٹ کی گئی تھی۔ یہ ٹیمپل ملائیشیا کا سب سے قدیم ٹیمپل ہے اور ان وقتوں کی یادگار ہے جب۔۔۔۔ چینی اپنے قدم جمانے کے بعد یہاں آباد ہونا شروع ہو گئے تھے۔

ہماری اگلی منزل ملا کا مینارا (Melaca Menara) تجویز ہوئی۔ شام کا ملگجا اندھیرا پھیلنا سے پہلے۔۔۔۔ ہم اس ٹاور تک آ گئے تھے جسے تامنگ سری ٹاور (Taming Sri Tower) بھی کہتے ہیں اور جو۔۔۔۔ ملائیشیا کا پہلا گھومنے والا ٹاور ہے۔ اس ٹاور کی بلندی ایک سو دس میٹر ہے اور اس میں پانچ درجن کے قریب لوگ بیٹھ سکتے ہیں۔ اس پول کے گرد کرسیوں پر بیٹھنے کا انتظام کیا گیا ہے اور جب یہ پول دھیرے دھیرے اس سٹنگ ارینج مَیٹ کو اوپر اٹھاتا اور پھر ایک تیز جھٹکے سے بلندی کی انتہا پہ لے جاتا ہے تو۔۔۔۔ لوگوں کے شور سے پورا ملا کا گونجنے لگتا ہے۔ میں نے بھی اس ریوالونگ پول پہ اپنے قدم جما دیے اور اس کے بلندی پہ جانے کا انتظار کرنے لگی۔ دل اس سے ہولا ضرور جب۔۔۔۔ بجلی کی سی تیزی سے بہت سے لوگ بلندی کی طرف بڑھے مگر رنگین نظاروں نے لمحہ بھر میں اس خوف کو اتار پھینکا۔ سمندر۔۔۔۔ دریا۔۔۔۔ شہر سب کچھ میرے سامنے تھا۔ سمندر پہ آہستہ آہستہ اندھیرے کی چادر پھیلنے لگی تھی مگر۔۔۔۔ اس چھوٹے سے تاریخی شہر میں قمقمے جلنے لگے تھے۔ قمقموں کی جگمگاہٹ زمین پر تھی اور ستاروں کی آسمان پر اور ان دونوں روشنیوں کے بیچ لٹکے ہوئے ہم۔۔۔۔ حسین نظاروں میں الجھے ہوئے تھے

اور پھر وہی ہوا۔

وقت نے آنکھیں بدل لیں اور ایک جھٹکے سے ہمیں زمین پہ اتار پھینکا گیا۔

بس اک خواب تھا جو کچھ منٹوں کی آسمانی رنگینی دکھانے کے بعد زمینی حقیقت میں بدل

گیا تھا مگر ۔۔۔ابھی رات کی کچھ رنگینیاں اور باقی تھیں ۔جن میں دریائے ملاکا میں کروز (cruise) کی سیر سرِ فہرست تھی اور اس طلسماتی شہر کو۔۔۔کروز میں ہولے ہولے رنگ برنگی روشنیوں میں ڈوبا دیکھنے کے لیے ہم چمکدار انتظار گاہ میں چلے آئے تھے جہاں ۔۔۔دریا کے ساتھ مختلف رنگوں کی کنوپیاں تنی ہوئی تھیں جو۔۔۔دور سے چھتریاں دکھائی دیتی تھیں۔ رات اتر آئی تھی اور رات کی تاریکی میں یہ رنگارنگ کینوپیاں اور ان سے چھلکتی روشنیاں پانی میں ہلچل مچائے ہوئے تھیں۔

یہ کشتی نما کروز بھی دلہن کی طرح سجے ہوئے تھے۔سیٹ پر بیٹھتے ہی میں نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی ۔۔۔ہر دیوار آرٹ کا بہترین نمونہ دکھائی دیتی تھی۔ننھا سا یہ کروز شہر کے بیچوں بیچ بہنے والے دریا میں بہت دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔دریا کے کنارے عمارات کی دیواروں پہ بھی قمقمے جل اٹھے تھے اور ان قمقموں کی روشنی میں دیواروں پر بنے نقش و نگار۔۔۔کسی اور ہی دنیا کا پتہ دیتے تھے۔پل بھر کو یہ گمان گزرا

جیسے میں صدیوں پیچھے چلی گئی ہوں۔

کسی پرانے دور میں گھوم رہی ہوں۔

یہ روشنیاں ۔۔۔یہ نقش و نگار۔۔۔دریائے ملاکا کو بھی رنگین کیے ہوئے تھے۔ کروز پلوں کے نیچے سے عمارتوں کے پیچھے سے ۔۔۔گزرتا رہا۔۔۔ پرانے دور اور نئے زمانے کے عکس ۔۔۔دکھاتا رہا اور گائیڈ ان کے بارے میں کچھ اس تیزی سے بتاتا رہا کہ ۔۔۔سب کچھ اوپر سے گزر گیا پھر ایک گھنٹے کی اس سیر میں ۔۔۔ہم نے گائیڈ کی طرف دیکھا بھی نہیں ۔۔۔صرف نظارے ہی دیکھتے رہے۔

دریا کے دونوں کناروں پہ روشنیاں آباد تھیں۔

میں ترکی کبھی گئی نہیں البتہ باسفورس کی جھلک ترکی کے ڈراموں میں ضرور دیکھی تھی

۔جانے کیوں مجھے یہ۔۔۔۔چھوٹا سا باسفورس لگا۔دریائے ملاکا کا پانی زیادہ گہرا نہیں بس انسانی ہاتھوں کے تراشے ہوئے نقوش نے دریا کے کناروں کو سجا رکھا تھا۔اور پھر کچھ دیر بعد کروز نے بھی ہمیں واپس طلسماتی دنیا سے نکال کے حقیقی دنیا میں پہنچا دیا۔پورے ملاکا کی سیر کرانے کے بعد وہیں پرلا کے اتار دیا جہاں اس دریا کا پانی سمندر کی آغوش میں جا گرتا ہے۔

یہیں قریب ہی وہ پرتگالی جہاز بھی تھا جو۔۔۔۔ایک پرتگالی مہم جو الفانسو القراق کے طمع ولالچ کی عبرت ناک داستان سنا رہا تھا جس نے ملاکا کے سلطان کو شکست دے کے اس خود مختار ریاست پہ اپنا قبضہ جمایا اور پھر۔۔۔۔کچھ ہی عرصے بعد یہاں سے تمام مال و دولت سمیٹ کے پلٹ گیا مگر بحر ہند کے طوفانی تھپیڑوں نے۔۔۔۔اسے سنبھلنے ہی نہ دیا۔ایک ریاست پہ فتح پانے والا تندو تیز موجوں سے شکست کھا گیا اور۔۔۔۔اپنے بحری جہاز اور لوٹ کے مال سمیت سمندر برد ہو گیا۔اب ملائیشین حکومت نے لکڑی کے بنے اس پرتگالی جہاز کے ماڈل کو میری ٹائم میوزیم (Maritime Museum) بنا دیا تھا۔ہم نے یہ ماڈل باہر سے دیکھا کیونکہ میوزیم کا ٹائم ختم ہو چکا تھا مگر پھر بھی ہم اس پانچ صدیوں پرانے جہاز کا ماڈل دیکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

اب ہمیں ڈیسم ان (Dasom Inn) جانا تھا۔بکنگ ہماری پہلے ہو گئی تھی مگر اس شہر کے چائنا ٹاؤن میں ایک جوکر سٹریٹ (Jouker Street) بھی تو اسی رستے میں تھی۔جس کا خوبصورت آرٹ ورک سے مزیّن بڑا سا گیٹ۔۔۔۔مختلف رنگوں کی روشنیوں اور نقش و نگار سے سجا تھا۔چائنا ٹاؤن کی اس اہم سٹریٹ میں سیاحوں کا میلہ لگا تھا۔ویک اینڈ پہ یہ بازار سیاحوں کے لئے رات بازار بن جاتا تھا۔ہم بھی اس رات میں بازار کا حصہ بنے ٹہلتے پھر رہے تھے۔بیٹی داماد کچھ ونڈو شاپنگ کر رہے تھے اور میں۔۔۔۔دلکش نقش و نگار کی پینٹنگ سے دل بہلا رہی تھی کہ پیروں کی اینٹھن اب زور پکڑنے لگی تھی۔

میں نے سوچا! سمندر کے کنارے آباد یہ ملایا ایسا طلسماتی شہر ہے کہ۔۔۔ گئے گوڈے ساتھ اگر نہ دیں تب بھی جس کی خوبصورتی تو ٹہل ٹہل کے بھی سمیٹی جا سکتی ہے۔

ریسٹورنٹ Dasom Inn پہنچ کے ہم ایسے بے سُدھ پڑے جیسے۔۔۔ گھوڑے بیچ کے آئے ہوں۔ آنکھ کھُلی تو دن چڑھ آیا تھا۔ بھاگم بھاگ ناشتے کے لئے پہنچے مگر۔۔۔ ہوٹل کا ڈائننگ ہال ویران پڑا تھا۔ ہم واپس اپنے کمرے میں آئے کچھ بیکری آئٹم اور چائے کے لوازمات سفر میں ارم ہمیشہ ساتھ رکھتی تھی۔ ہم نے خود بنایا ناشتہ کیا۔۔۔ تیار ہوئے ۔۔۔ سامان سمیٹا اور حساب کتاب کر کے باہر نکل آئے۔ اب ہمارا سب سے پہلا ٹارگٹ سجاوٹی ترشوا کی سیر تھی۔ مگر اس مہم کو سر کرنے سے پہلے بچوں کے لئے قریب میں ایک بڑا سا مال داتاران پھلاوان میگا مال (Dataran Pahlawan Mega Mall) دیکھنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں تو اس رنگین نقش و نگار والے بڑے سے گیٹ کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ ۔۔۔ ہر جگہ کے الگ رنگ ڈھنگ اور وہاں کے مکینوں کے الگ ذوق ہوتے ہیں۔

ترشوا کی سیر نے ملایا کی پوری تاریخ میرے سامنے رکھ دی تھی۔ مختلف قوموں کی تہذیب یہاں جھلک رہی تھی۔ مسلمانوں کی مساجد۔۔۔ پرُتگالی چرچ اور برطانوی چرچ، چینی ٹیمپل ۔۔۔ قلعے اور کھنڈرات کئی صدیوں کی داستان سنا رہے تھے۔ اس شہر کی تاریخ بہت شاندار ہے اور حال بہت جان دار، بہت مال دار ہے۔ سیاحت نے اس شہر کو سچ مچ بھاگ لگا رکھے ہیں۔

وقت تیزی سے بھاگ رہا تھا اور ہم تھوڑے دیکھے کو بہت جانتے ہوئے اس مالدار شہر کی بکھری تاریخ کے نظارے لوٹنے میں لگے تھے۔ کہیں راہ میں کلاک ٹاور دکھائی دیتا تھا تو دوسری سمت نصب مجسمہ کبھی ہماری توجہ اپنی طرف کر لیتا تھا۔ سینٹ پال چرچ کی سرخ عمارت سے نظر ہٹتی تھی تو سامنے۔۔۔ فاؤنڈیشن آجاتا تھا۔ اس شہر میں بار بار بدلتے حکمرانوں نے بھی

یہاں بہت سے نشان ثبت کر رکھے تھے۔ جن میں سے بہت سی باقیات اب کھنڈرات میں بدل گئی تھیں۔ ساحل سمندر کے قریب ایک پہاڑی پر بنا قلعہ بھی انہیں باقیات میں سے تھا۔ جسے سولہویں صدی کے اوائل میں پرتگالی مہم جو نے تعمیر کرایا اور جسے بدلتے ادوار نے شکستہ حال کر دیا۔ اب اس قلعے کا صرف داخلی دروازہ ہی بچا تھا۔ قلعہ منہدم ہو جانے کے باوجود یہ داخلی دروازہ بھی "ہاتھی مرا سوا لاکھ" کے مصداق ریاست کو مالا مال کئے جا رہا تھا۔ پورے ملایا پہ بھاگتے دوڑتے نظر ڈالتے ہوئے ہم نے نکلنے کی ٹھانی۔ بھاگم بھاگ دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے ریستوران Limau Limau کے اپر فلور پہنچے۔ جانکر سٹریٹ کے قریب یہ ریسٹورنٹ ۔۔۔ افضال نے اپنے کسی دوست کے کہنے پہ ڈھونڈا تھا اور اس ریسٹورنٹ کے اپر فلور پہ بیٹھ کے کھانا کھاتے ہوئے مجھے اپنے دامن کوہ کی یاد آ گئی تھی۔ ویسا ہی ٹھنڈا ٹھار اور خوشگوار ماحول تھا۔ میں نے کھانا کھانے کے بعد ایک نظر ریسٹورنٹ سے باہر چاروں طرف دیکھا۔ ملایا کی ہواؤں کو آخری سلام کہا اور صدیوں کا سفر طے کرتے ہوئے واپسی کے لیے گاڑی میں جا بیٹھی کہ اب ملایا سے کوالالمپور اور کوالالمپور سے ایپوہ (سری اسکندر) کا ایک تھکا دینے والا سفر بھی تو کرنا تھا۔

ادھوری عمارت، ادھورا خواب

دور سڑک سے ہی اک بلند عمارت کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ دو رویہ پھولوں سے سجے رستے پہ چلتے ہوئے۔۔۔ دھیرے دھیرے اونچائی کی سمت سفر طے کرتے ہوئے ۔۔۔ تھوڑا آگے چل کے چوڑے پاٹ کی ندی پر بنے ہوئے کشادہ پل کو پار کرتے ہوئے جب ہم ۔۔۔ یہاں پہنچے تو ایک نامکمل عمارت ہمارے سامنے تھی۔ لیکن اپنے اس ادھورے پن کے باوجود یہ عمارت ۔۔۔ شان وشوکت کی جھلک دکھلاتی تھی اور اپنے مکینوں کے ذوق و شوق کی داستان سناتی تھی۔ اس عمارت کے بڑے بڑے کمرے ۔۔۔ ویران ہوتے ہوئے بھی خوب روشن دکھائی دیتے تھے کہ سورج کی کرنیں ۔۔۔ قطار در قطار محرابوں سے در آتی تھیں اور نہ صرف بالائی منزل ۔۔۔ بلکہ نچلی منزل کے در و دیوار کو بھی سنہرا کر جاتی تھیں۔ یہاں آنے والے جب دالان سے کمرے تک کا چکر لگاتے تھے تو ان کے سائے ۔۔۔ اس ڈھلتی دھوپ میں ان کے قد سے بھی بڑھ جاتے تھے اور یہ تھرتھراتے ہوئے سائے ۔۔۔ اس ویران فضا میں طلسماتی خوف کی چادر تان دیتے تھے۔

تاریخی عمارتیں ایسی ہی طلسماتی فضا لئے ہوئے ہوتی ہیں۔

ماضی کی گرد میں ڈوبی یہ عمارتیں اپنے وقتوں کی داستانیں سناتی ہیں اور اپنے مکینوں کے بھید بھاؤ بتاتی ہیں۔

یہ شاندار ادھوری عمارت بھی اپنے مکینوں کے ادھورے رہ جانے والے خوابوں کی داستان الم سنا رہی تھی۔

1915ء سے 1926ء تک تعمیری مراحل کی تگ ودو کے بعد بھی نامکمل رہ جانے والی یہ عمارت ۔۔۔۔ جسے کیلیز کاسل (Kellie's Castle) کہا جاتا ہے ۔وہ کبھی کیلیز ہاؤس (Kellie's House) ہوا کرتی تھی ۔ اپوہ (IPOH) سے بیس منٹ کی مسافت پر۔۔۔۔ باتو گاجا (Batu Gaja) کے قریب گھنے جنگلوں میں دبکا۔۔۔۔ ہر سمت شاداب درختوں میں گھرا۔۔۔۔ ایک پہاڑی کی پشت سے چپکا۔۔۔۔ سکاٹش، موروش اور انڈین طرز سے بنا یہ کیلیز ہاؤس ۔۔۔۔لہراتی بل کھاتی چوڑے پاٹ کی ندی کے پار دوسری طرف۔۔۔۔ اداسی کی چادر لپیٹے ہوئے ولیم کیلیز سمتھ (William Kellie's Smith) کے خوابوں کی ادھوری تعبیر بنا کھڑا تھا۔

ولیم کیلیز سمتھ۔۔۔۔ایک سکاٹش انجینئر جو 1870ء میں سکاٹ لینڈ کے ایک قصبے میں پیدا ہوا اور بیس برس کی عمر میں 1890ء میں اپنی دنیا تلاشنے نکل کھڑا ہوا۔ اپنی دُنیا آپ پیدا کرنے کا شوق ہی اسے ملایا لے آیا تھا۔ وہ جب یہاں آیا تو ملایا ابھی ملائیشیا نہیں بنا تھا۔ بہت سے غیر ملکی آقاؤں نے قدرتی خزانوں سے بھرے اس دیس میں ۔۔۔۔ اپنی اپنی مرضی اور اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اکھاڑ پچھاڑ کر کے خوب لوٹ مار مچا رکھی تھی ۔ ولیم کیلیز سمتھ یہاں آیا اور باتو گاجا کے قریب سینکڑوں ایکڑ پر پھیلے جنگلات اور کنتا اسٹیٹ کے مالک الما باکر (Alma Bakar) کے ساتھ منسلک ہو گیا۔ محنت اس کی گھٹی میں تھی اور آگے بڑھنے کا شوق اس کی رگوں میں دوڑتا تھا۔ اپنی انہی دو خوبیوں کے ساتھ اس نے ساجھے داری کی بنیاد پر کنتا اسٹیٹ کو سنوارنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے اس نے جنگلات صاف کرائے اور پھر وہاں ربڑ کی کاشت شروع کر دی ۔۔۔۔ سڑکیں تعمیر کرائیں اور تجارت کو آسان بنا دیا۔ ولیم کیلیز سمتھ کی اس حکمت عملی نے ویران

جنگل میں تجارت کو فروغ دے کر نہ صرف الماباکر کو مزید مالا مال کر دیا تھا بلکہ وہ خود بھی۔۔۔ بہت سی زمین خریدنے کے قابل ہو گیا تھا اور اس زمین پہ اپنی ایک چھوٹی سی ذاتی اسٹیٹ کی بنیاد بھی رکھ چکا تھا۔

پردیس میں مضبوطی سے اپنے قدم جمانے اور بہت سی جائداد بنانے کے بعد 1903ء میں وہ واپس اپنے وطن سکاٹ لینڈ گیا اور وہاں کئی برسوں سے اپنی منتظر اینجیز (Anges) کو جیون ساتھی بنا کر ملائیشیا پلٹ آیا۔

قسمت اس پہ مہربان تھی۔۔۔

جائیداد اور دولت جیسی نعمتیں اس کا مقدر بنی تھیں۔۔۔

زندگی خوبصورت ہو گئی تھی اور ہیلن (Hellan) نے آ کر اس کی زندگی کو اور بھی خوبصورت بنا دیا تھا۔ وقت تیزی سے گزرتا جاتا تھا۔ ولیم کیلیز سمتھ کی دولت قلانچیں بھرتی آگے ہی بھرتی جاتی تھی اور ایسے میں۔۔۔ جائداد کا وارث پیدا ہو جانے کی کی تمنا اس کے دل میں سر اٹھاتی تھی مگر ہیلن کی دسویں سالگرہ ہو جانے کے بعد بھی۔۔۔ اس کی یہ امید بر آتی نظر نہیں آتی تھی تو اس کمی کی کسک۔۔۔ اسے اور تڑپاتی تھی اور مایوس کر جاتی تھی۔ اسے مایوسی میں گھرا دیکھ کر اس کی کمپنی میں کام کرنے والے مدراسی مزدوروں نے۔۔۔ اسے امید کی کرن دکھاتے ہوئے اماں دیوی سے منت مانگنے کا مشورہ دیا تھا جسے ضرورت مند ولیم کیلیز سمتھ نے بنا حیل و حجت مان کے اماں دیوی کے آگے دست سوال دراز کر دیا تھا اور پھر۔۔۔ قدرت اس پر مہربان ہو گئی تھی۔ اماں دیوی نے اسے مایوس نہیں کیا تھا۔

نیلی آنکھوں والے انتھونی کے ننھے وجود نے ولیم کیلیز سمتھ کی زندگی میں خوشیوں کے رنگ بھر دیے تھے۔

اس کی اب ہر خواہش پوری ہو گئی تھی مگر۔۔۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ بندہ عمر بھر

خواہشوں کے تانے بانے ہی بنتا رہتا ہے۔ایک خواہش کے پورا ہو جانے کے بعد ایک اور خواہش پال لیتا ہے۔

انجینیز نے اسے وارث دیا تھا۔اب وہ اس خوشی میں ۔۔۔اپنی محبوبہ بیوی کو ایک شاندار سا وسیع وعریض قلعہ نما گھر دینا چاہتا تھا۔دل میں اس خواہش کے انگڑائی لیتے ہی اس نے انڈین ۔۔۔سکاٹش اور موروش آرکیٹیکچر بلا لیئے۔۔۔نقشہ تیار کیا گیا۔۔۔پتھر اٹلی سے منگایا گیا اور اینٹیں۔۔۔انڈیا سے لائی گئیں۔انڈیا سے ماہر کاریگر اور مزدوروں کی ایک کھیپ بلائی گئی اور۔۔۔کیلیز ہاؤس کی تعمیر زوروشور سے شروع ہوگئی۔جب اُس دومنزلہ مینشن کا چھ منزلہ ٹاور بنا تو بیرون ملک سے برقی زینہ منگایا گیا جس نے۔۔۔ملائیشیا میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں اس کیلیز ہاؤس کی دھوم مچا دی۔لندن کے اخباروں میں اس کا خوب چرچا ہوا کہ ۔۔۔ملائیشیا میں تب بجلی سے چلنے والا یہ پہلا زینہ استعمال کیا گیا تھا۔دور دور سے لوگ اس قلعہ نما گھر کو دیکھنے کے لیے آنے لگے جس میں۔۔۔طویل راہداریاں تھیں۔۔۔ان ڈور ٹینس کورٹ تھے۔۔۔بار روم روف ٹاپ کورٹ یارڈ۔۔۔بنائے گئے تھے اور جس کے کمروں کی دیواریں یونانی ورومن نقش ونگار سے آراستہ تھیں۔

کیلیز ہاؤس کی تعمیر کا کام جاری تھا کہ اچانک ایک ناگہانی اُفتاد نے کام روک دیا۔

ستر کے قریب مزدور پُراسرار طور پر مردہ پائے گئے۔جس سے علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا۔بہت سوں نے اس واقعے کو نظرِ بد کہا۔۔۔بہت سوں نے بھوت پریت کی کارستانی قرار دیا جبکہ زندہ بچ جانے والے ہندو مزدوروں نے اسے۔۔۔اماں دیوی کے قہر و غضب کا شاخسانہ بتایا۔

ہندو مدراسی مزدوروں کی یہ بات ولیم کیلیز سمتھ کے دل میں پھانس بن کے اٹک گئی۔وہ اپنی خوشی میں واقعی نذرانہ اتارنا، چڑھاوا چڑھانا بھول گیا تھا تب اس بھول چوک کی تلافی

کرنے کو اس نے اپنی زمین پہ۔۔۔۔ کیلیز ہاؤس سے کچھ فاصلے پر اماں دیوی مندر کی تعمیر شروع کرادی اور مندر تک اپنی حاضری دینے کے لیے۔۔۔۔ گھر سے مندر تک ایک سرنگ بھی تیار کرائی مگر ہندو مت پہ پختہ عقیدہ رکھنے والے اس سکاٹش انجینئر کو۔۔۔۔ ایک بار بھی اس رستے پہ آنا جانا نصیب نہ ہو سکا کیونکہ۔۔۔۔ گھر کی تعمیر دوبارہ شروع ہو کر پھر رک گئی تھی۔

اس بار ایک نئی اڑچن سامنے آگئی تھی۔ ایشیا سے یورپ تک پھوٹنے والی سپینش فلو کی موذی وبا نے۔۔۔۔ دنیا بھر کے لاکھوں افراد کو موت سے ہمکنار کر دیا تھا۔ کیلیز ہاؤس کے مزدوروں اور کاریگروں کی کثیر تعداد بھی اس کی زد میں آ کر لقمۂ اجل بن گئی تھی۔ یہ حادثہ پھر سب کو خوفزدہ کر گیا تھا۔ ولیم کیلیز سمتھ کی زیادہ اجرت کی پیشکش پر بھی مزدور یہاں کام کرنے کو راضی نہ ہوئے تھے۔

اب کے جو کیلیز ہاؤس کا کام رکا تو پھر رکا ہی رہا کہ 1926ء میں۔۔۔۔ جب ولیم کیلیز سمتھ کاروباری سلسلے میں پرتگال گیا تو وہ بھی۔۔۔۔ سپینش فلو کی زد میں آ گیا۔ زندگی نے اس سے بے وفائی کی۔ قسمت کا دھنی تقدیر کے ہاتھوں مارا گیا۔ سپنوں کا تاج محل ادھورا رہ گیا اور ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی یہ مکمل نہ ہو سکا۔ اب لوگ اسے Kellie's Folly کہتے تھے۔ ایپوہ تک آنے والے لوگ یہاں ضرور آتے تھے اور۔۔۔۔ خوابوں کے اس کھنڈر کو دیکھ کے افسردہ ہو جاتے تھے جہاں۔۔۔۔ انسانوں کی بجائے ویرانی آباد تھی جہاں ہر طرف مکڑی کے جالے تھے اور بقول گائیڈ شام ڈھلتے ہی یہاں کے مکینوں کی بے چین روحیں بھٹکتی پھرتی تھیں اور گھر کی بربادی پہ نوحہ خوانی کرتی تھیں۔ میں نے بھی چشمِ تصور سے گھنگھریالے بالوں والی ہیلن کو سفید سکرٹ پہنے دالان میں مضطرب گھومتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ تاریخ کے قدموں کی چاپ مجھے ڈرا گئی تھی اور میں خوفزدہ ہو کر۔۔۔۔ اس کیلیز کاسل سے باہر نکل آئی تھی۔ یوں تو میں کتنی دیر اس کیلیز کاسل کے پہلو میں بہنے والی ندی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی۔۔۔۔ گھروں کو واپس

پلٹنے والے پنچھیوں کی اڑانیں دیکھتی رہی پر میرا دل ۔۔۔ کیلیز کاسل کی ویرانیوں میں الجھا رہا۔ مکینوں کی بربادی کا خیال ۔۔۔ میری آنکھوں میں نمی دے گیا۔ ایسی نمی جو آنسو بن کے آنکھوں سے باہر نہیں نکلی بلکہ ۔۔۔ دل کی آگ پہ گر کے دکھ کے مرغولے بنا گئی۔

اس اداس نگری سے نکل کے واپس پلٹنے سے پہلے لمحہ بھر کو ہم نے ۔۔۔ اماں دیوی مندر کے درشن کیے جہاں اب بھی ۔۔۔ بھجن کی آواز گونجتی تھی اور اِکا دُکا لوگ ماتھا ٹیکتے دکھائی دیتے تھے۔ لوبان ۔۔۔ اگربتی کی خوشبو پھیلتی تھی اور قریبی ہندو آبادی کے لوگ پرشاد لینے کے لئے لپکتے تھے۔ ہم نے پرشاد لینے کی اس دھینگا مشتی کی کچھ تصویریں بنائیں اور ۔۔۔ تاروں کی ٹمٹماہٹ نمودار ہونے سے پہلے اپوہ چلے آئے۔ جالان سلطان یوسف پہنچے اور رتی گولڈ کورنگ (Rathi Gold Covering) میں داخل ہو گئے۔ یہ ہمارے اپنے کریم بخش جیسا ایک مال تھا جہاں ۔۔۔ خواتین کی سج دھج کے لیے انڈین سامان کی بڑی ورائٹی موجود تھی۔ میرے داماد نے یہاں سے اپنی بہنوں اور بھابیوں کے لیے کچھ تحائف خریدنا تھے۔ جنہیں پہنچانے کا فریضہ میں نے انجام دینا تھا۔ لہذا وہ دونوں میاں بیوی اس بڑی سی دکان میں گم ہو گئے اور میں اپنی نواسی تعبیر کو گود میں لئے کاؤنٹر کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی اور اس پرکشش خاتون کو دیکھنے لگی جس نے ۔۔۔ کاؤنٹر سنبھالا ہوا تھا اور بڑی محویت سے یہ گیت سن رہی تھی۔

کرتی میری چھینٹ دی ڈوپٹہ میرا لہریا
لین کانوں آئیوں ساہنوں پیکے ہُن ویریا
جا ماں دیاں پکیاں کھا ہن ڈھولا وے
جاندا اے تیرے نال ساڈا پولا وے

میں بھی سریندر کور کی سریلی آواز میں کھو گئی۔ سریندر کور اور پرکاش کور ہی تو وہ بلبلیں تھیں پولا جن کے گیت سن کے مجھے کم عمری میں ہی پنجابی سے عشق ہو گیا تھا۔ میرے گاؤں کی

ماسی نوابوا اپنی کراری آواز میں ان سکھنیوں کے گیت گاتی تھی تو میں یہ گیت اپنی کاپی پہ لکھتی جاتی تھی۔

مجھے گیت میں محو دیکھ کے آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔ آپ جی نوں پنجابی آوندی اے جی؟

ہاں بھئی! میں وی پنجاب دی رہتل آں۔ ساہیوال پاکستان دی جم پل آں تے ہُن لاہوروں آئی آں۔ میں نے اپنا مکمل تعارف کرا دیا تھا اور اس کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ وہ بھی شاید اپنی بات کہنے کو مضطرب تھی تبھی۔۔۔۔ میرے ذرا سا کریدنے پر اس نے اپنا دل کھول کے۔۔۔۔ میرے سامنے رکھ دیا تھا۔

وہ رتی تھی!

اس دکان کی مالکہ جو۔۔۔۔ انبالہ (انڈیا) کی رہنے والی تھی اور جسے محبت کی گھمن گھیریاں یہاں لے آئی تھیں۔ موہن (ایپوہ) ملائیشیا سے (انبالہ) انڈیا اپنے عزیزوں کی لڑکی شکنتلا کو پسند کرنے گیا تھا اور دل۔۔۔۔ رتی کو دے بیٹھا تھا۔ رتی۔۔۔۔ شکنتلا کی بچپن کی سہیلی تھی۔۔۔۔ جن کے گھر ساتھ ساتھ جڑے تھے اور جن کے دل بھی۔۔۔۔ اک دوجے سے ملے ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آس پڑوس کے دکھ سکھ سانجھے ہوا کرتے تھے۔ مہمان بھلے کسی کے گھر میں آئے۔۔۔۔ اس کی خاطر داری ہمسایوں پہ بھی فرض ہو جایا کرتی تھی۔

رتی کی ماں نے بھی پالک پنیر اور رَوے کا حلوہ خاص طور پر ملائیشیا سے آئے ہوئے مہمانوں کے لئے بنا بھیجا تھا۔ بس رتی وہ پکوان دینے آئی تھی اور سیدھی۔۔۔۔ موہن کے دل میں جا اتری تھی۔ اب جبکہ شکنتلا اور موہن کی بات پکی ہونے کو تھی تو کہانی۔۔۔۔ کسی اور طرف مڑ گئی تھی۔ جس نے دونوں گھرانوں کے دیرینہ تعلق میں دراڑ ڈال دی تھی مگر شکنتلا نے۔۔۔۔ ذرا جی میلا نہ کیا تھا بلکہ موہن کا ساتھ دینے کو گھر والوں سے ٹکر لی تھی۔ اپنی اور رتی کی ماں کو راضی

کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلے تھے تب کہیں جا کے۔۔۔یہ بیل منڈھے چڑھی تھی۔بس تب سے اب تک پورے پچیس برس گزر جانے کے بعد بھی وہ دونوں بہت خوش زندگی گزار رہے تھے۔اولاد کی کمی کے باوجود موہن اب بھی اس کی پوجا کرتا تھا اور رتی بھی۔۔۔اس پر جان دیتی تھی۔البتہ پہلے پہل موہن کی محبت میں پور پور ڈوبی۔۔۔رتی کے دل میں۔۔۔بغاوت سر اٹھاتی تھی اور ماں بننے کی تمنا اسے پہروں رلاتی تھی مگر موہن کی والہانہ محبت کی وارفتگی اس کی بغاوت کو کچل دیتی تھی کہ۔۔۔رتی کے قدموں تلے پلکیں بچھانے والا اس کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا تھا۔

وہ اس قابل تھا ہی نہیں!

ڈاکٹر کی رپورٹ نے لمحہ بھر کو رتی کی پرسکون دنیا میں ہلچل ضرور مچائی تھی مگر اس نے۔۔۔بڑی جی داری کے ساتھ ممتا کے سارے جذبے موہن کی محبت پر سے وار دیے تھے اور اب وہ دونوں۔۔۔ایک دوجے سے نظریں چرا کر نہیں نظریں ملا کر جی رہے تھے کہ قدرت سے اڑی وہ نہیں کر سکتے تھے اور بے وفائی ان دونوں کی سرشت میں نہیں تھی بلکہ وہ تو۔۔۔اس کڑی آزمائش سے بھی اک دوسرے کو حوصلہ دیتے ہوئے نکل آئے تھے جو وقت۔۔۔ان کی جھولی میں ڈال گیا تھا اور شکنتلا کی ابنارمل بیٹی لاجونتی ان کی زندگی میں آ گئی تھی۔

رتی اپنی شادی کے کچھ عرصہ بعد موہن کے بھائی سے شکنتلا کو بیاہ لائی تھی۔سال بعد ہی اللہ نے شکنتلا پر رحمت کر دی۔شکنتلا کی کوکھ ہری ہو گئی تھی مگر۔۔۔کہانی پھر رخ بدل گئی تھی۔

ادھر لاجونتی نے دنیا میں آنکھیں کھولیں ادھر شکنتلا کی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔اپنی تخلیق کو نظر بھر دیکھ بھی نہیں پائی وہ۔۔۔جس خوشی کا گھر بھر کو انتظار تھا وہ۔۔۔غم کا سیلاب لے کے آئی تھی۔تب رتی نے شکنتلا کی نشانی کو سینے سے لگا لیا تھا۔لاجو کو اپنی گود میں بھر کے اپنی ممتا کو سرشار کرنا چاہا تھا مگر۔۔۔وہ لاجو کی ماں بن کے بھی لاجو سے ماں کا لفظ نہ سن

سکی تھی کہ لاجو۔۔۔۔جذبوں سے عاری اک جیتا جاگتا وجود تھی جسے۔۔۔۔گزشتہ سولہ برسوں سے وہ سنبھالے ہوئے تھی۔رتی یہ کہہ کر اٹھی اور کاؤنٹر کے پیچھے والا دروازہ کھول دیا جہاں ۔۔۔۔وہیل چیئر پہ رال ٹپکاتی نیم وا آنکھوں سے تکتی لاجو کو ملازمہ سنبھالے ہوئے تھی۔اس نوجوان بچی کو یوں بے سدھ دیکھ کے میرا دل کانپ گیا۔

کیسی آزمائشوں سے گزر رہی تھی رتی؟ مجھے اس پہ ترس آنے لگا۔

رب کسی کو ایسی آزمائش میں نہ ڈالے۔میں آبدیدہ سی ہوگئی۔رتی دروازہ بند کر کے پلٹی تو میں نے دیکھا۔۔۔۔کوششِ ضبط کے باوجود دو بے رنگ موتی اس کے گالوں پہ ڈھلک گئے تھے۔

ہم دونوں چپ تھیں۔

ہمارے سامنے پڑی ہوئی چائے برفوں میں اتر گئی تھی۔

دل پہ اداسی کی ایسی برف گری تھی کہ اب۔۔۔۔سریندر کور کی کُوک بھی بھلی نہیں لگ رہی تھی۔بچے شاپنگ کر آئے تھے۔

ان کے آتے ہی میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔رتی بھی میرے ساتھ ہی اٹھی اور الوداع کہنے کو میرے قریب آگئی۔میں نے پہلی اور آخری بار۔۔۔۔وفا کے اس پیکر کو گلے لگایا۔۔۔۔دل ہی دل میں اس کے حوصلے کو سراہا اور یہ سوچتے ہوئے Rathi Gold Covering سے باہر نکل آئی کہ۔۔۔۔

کچھ تعلق آپ ہی آپ بن جاتے ہیں۔ایسے تعلق جنہیں نبھانا بھی ممکن نہیں ہوتا اور ۔۔۔۔جن کو بھول جانا بھی کچھ آسان نہیں ہوتا۔

پینکور آئس لینڈ کا ہرا سمندر

لومٹ (Lumut) تک تو میں پہلے بھی آئی تھی مگر اس کے دوسری طرف ۔۔۔سمندر پار جزیرے پہ جانے کی خواہش مجھے دوبارہ یہاں لے آئی تھی۔لومٹ تک ہم اپنی گاڑی میں آئے تھے جہاں ہمیں ۔۔۔میڈان کِڈ (Medan Kid) سے بس میں بیٹھنا تھا اور اس جگہ اترنا تھا جہاں سے سمندروں کا سینہ چیرتی فیری (Ferry) نے ہمیں ۔۔۔چھوٹے چھوٹے جزائر کی سیر کراتے ہوئے پینکور آئس لینڈ (Panckor Island) پہنچانا تھا۔

میدان کِڈ پہ ماس ریپڈ ٹرانسپورٹ کی بسیں موجود تھیں۔ یہ بسیں ملائیشیا کے طول و عرض میں چلتی تھیں اور ۔۔۔سستا اور آرام دہ سفر مہیا کرتی تھیں۔ ہمارا یہ سفر زیادہ طویل نہ تھا۔ کچھ ہی دیر میں بس نے ہمیں لومٹ (Jetty) یعنی فیری سٹاپ پہ اتار دیا۔لوگوں کی خاصی تعداد یہاں موجود تھی کہ اس دیس میں سیر و تفریح بھاری خرچے کی طلبگار نہیں۔ پان سلور فیری سے پینکور آئس لینڈ جانے اور واپس آنے کا ٹکٹ ۔۔۔صرف دس رنگٹ تھا۔ٹکٹ لیتے ہی ہم سلور فیری کی طرف بڑھے۔ یہ چھوٹا سا ایک سمندری جہاز تھا۔ میں جس میں پہلی بار قدم رکھ رہی تھی ۔اس سے دل کی خوشی دیدنی تھی ۔۔۔حیرت تھی ۔۔۔استعجاب تھا۔ایک بن دیکھا خواب تھا جو ۔۔۔پورا ہونے کو تھا۔فیری میں ایک چھوٹی سی دنیا آباد تھی اور لگ بھگ سو مسافر اس دنیا کے باسی تھے جو حبس اور گرمی سے بلبلائے ہوئے تھے۔اپنے وقت مقررہ پر فیری نے حرکت کی۔

پہلے کچھ دیر ہولے ہولے جھولتی ہوئی ہچکولے لیتی رہی۔ انجن کی گڑگڑاہٹ کا شور کانوں کو برمانے لگا۔ پھر دھیرے دھیرے۔۔۔۔ پانی میں ارتعاش پیدا کرتی ہوئی یہ فیری آگے بڑھی اور سمندر کا سینہ چیرنے لگی۔ رفتار ذرا تیز ہوئی تو شہر کی بلند و بالا عمارتوں کو پیچھے چھوڑتی۔۔۔۔ نیلے پانیوں پہ تیرنے لگی۔ سمندر جو ابھی اتنا بے چین نہیں ہوا تھا فیری کے رفتار پکڑتے ہی مچلنے لگا پر۔۔۔۔ فیری اس سمندر کے سینے پہ مونگ دلتی ہوئی۔۔۔۔ سرکش لہروں سے لڑتی ہوئی۔۔۔۔ پانی کی بے چینیوں کو اپنے وجود تلے روندتی ہوئی جھومتی جھامتی آگے بڑھتی رہی۔

میں نے کھڑکی کے شفاف شیشے سے باہر دیکھا۔

جہاں تیز دھوپ تھی اور اس تیز دھوپ کی روشنی میں۔۔۔۔ سمندر کا گہرا نیلگوں پانی دھوپ کی سنہری آمیزش سمیٹے اپنی وسعتوں کا دامن پھیلائے ہوئے تھا۔ دور کہیں ایک اور فیری بھی دکھائی دے رہی تھی مگر۔۔۔۔ تیز شور کی آواز ہمیں اپنے بالکل پاس سنائی دے رہی تھی۔ میں ابھی اس صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش میں تھی کہ اچانک۔۔۔۔ ایک فیری بالکل ہماری فیری کے عقب سے آتی ہوئی نظر آئی جس کی چال مستانہ تھی اور جھومنے کا انداز دلبرانہ تھا۔ اس فیری کے ہماری فیری کے قریب آتے ہی سمندر۔۔۔۔ جو اپنی مخصوص چال میں رواں تھا کسی ضدی بچے کی طرح مچلنے لگا اور جب۔۔۔۔ وہ فیری اِٹھلاتی۔۔۔۔ شور مچاتی۔۔۔۔ ہماری فیری کے پاس سے گزر کے آگے بڑھ گئی تو ہماری فیری بھی جھوم اٹھی مگر۔۔۔۔ صد شکر لڑکھڑائی نہیں بلکہ۔۔۔۔ اپنی مخصوص چال میں آگے بڑھتی گئی۔

اس فیری کے جاتے ہی سمندر کو پھر چپ سی لگ گئی مگر۔۔۔۔ اتنے میں آسمان نے اپنے تیور بدل لیے تھے۔ گھنگھور گھٹائیں اُمڈیں اور دن کو رات میں بدل گئیں۔ بارش پہلے ہلکی تھی۔۔۔۔ پھر تیز ہوئی اور اس کے بعد تیز تر ہو گئی۔۔۔۔ فیری کی کھڑکی کے شیشوں پہ بوندوں کا رقص ماحول کو دیوانہ سا کر گیا۔

میں پانی سے پانی کا ملن دیکھنے فیری کی چھت پہ چلی آئی۔ جہاں انجن کی چنگھاڑ تھی۔۔۔ بوندوں کا جلترنگ تھا اور سمندر کی بے تابی تھی۔ والہانہ بوندیں برستی تھیں اور بے تابانہ سمندر سے لپٹ جاتی تھیں۔ قدرت کے حسین نظارے میرے سامنے تھے۔ دور کہیں کہیں ۔۔۔چھوٹے چھوٹے سے جزیرے بھی نظر آتے تھے جو خشکی اور تری کو۔۔۔ ایک دوسرے سے ملاتے تھے۔ Sungai Pinang Kecil ایسا ہی ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جہاں کچھ دیر کو ہماری سلور فیری نے ڈیرے ڈالے تو افراتفری کا سماں دیکھنے میں آیا تھا۔ کچھ مسافر بڑے بڑے تھیلے گھسیٹتے ہوئے اتر گئے اور کچھ نئے مسافر ہمارے ہمسفر بنے اور سفر دوبارہ پھر شروع ہو گیا۔ میں فیری کی چھت پہ ریلنگ تھامے یہ سب دیکھتی رہی۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے موسم نے پھر گرگٹ کی طرح رنگ بدل ڈالا۔ بارش تھم گئی تھی اور دھوپ کی تیزی اب چُبھن دینے لگی تھی۔ سمندر پہ پوری آب و تاب سے چمکتا سورج ۔۔۔پانی کو سنہرا کئے ہوئے تھا۔ جب یہ سورج اچانک ہی بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلنے لگتا تو ۔۔۔بہت دور دکھائی دیتے پام کے درخت سفید بادلوں کی چادر اوڑھ لیتے تو ایسے میں یہ سبز اور سفید رنگ کا امتزاج مجھے اپنے پاکستانی پرچم کی یاد دلاجاتا۔

فیری نے رستے میں دو جگہ اور پڑاؤ کیا۔ یہ جہاں رکتی تھی وہاں۔۔۔ اور بھی فیریز، سٹیمر اور کشتیاں دکھائی دیتی تھیں جو ان جزیروں پہ بسنے والوں کو۔۔۔ دوسرے جزیروں اور شہروں سے ملاتی تھیں اور سمندر کو۔۔۔ خشکی سے جوڑتی تھیں۔

کبھی جغرافیہ میں پڑھا تھا کہ بحرالکاہل دنیا کا سب سے بڑا سمندر ہے جو۔۔۔ چار بڑے براعظموں کے بیچ زمین کے کل رقبے کے ایک تہائی حصے پہ بچھا ہوا ہے اور اس وسیع و عریض سمندر میں۔۔۔ پچیس ہزار سے زائد جزائر موجود ہیں اور ان چھوٹے چھوٹے جزیروں میں پھیلی مختلف تہذیبوں کا وجود۔۔۔ بحری سفر اور اس کے مسافروں کی بدولت ہے۔ دنیا کی

نظروں سے دور یہ جزیرے گئے وقتوں میں کسی نعمت سے کم نہیں تھے کہ تب بحری جہاز ۔۔۔بادبان کی بدولت سمندر کے سینے پر سفر کیا کرتے تھے۔ایسے میں انہیں ان جزیروں پہ ضروریات زندگی۔۔۔علاج معالجے اور جہازوں کی مرمت کی سہولیات میسر آجایا کرتی تھیں۔دنیا کے جن چھوٹے بڑے ممالک میں یہ جزیرے موجود ہیں۔ملائیشیا بھی۔۔۔ان ملکوں میں شامل ہے۔

پینکور آئس لینڈ ملائیشیا کے انہی جزیروں میں سے ایک ہے جو ملائیشیا کے جنوب مغرب میں۔۔۔تھائی لینڈ کے ساحل سے جڑا ہے۔آٹھ اسکوائر کلومیٹر پہ پھیلا ہوا یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔جس کی آبادی تو محدود ہے لیکن سیاحوں کی آمدورفت۔۔۔اس آبادی کو بڑھاوا دیئے رکھتی ہے۔یہ پانی پہ بسا ایک شہر ہے جو۔۔۔مقامی مچھیروں۔۔۔سوداگروں اور قزاقوں کی پناہ گاہ ہے۔

ہم اس پانی پہ بسے ہوئے شہر میں پہنچ گئے تھے۔فیری نے ٹھیک پینتالیس منٹ کے بعد ہمیں پینکور آئس لینڈ کے حوالے کر دیا تھا۔جونہی ہم پینکور جیٹی سے باہر نکلے،سامنے ۔۔۔منی وین اور ٹیکسی گاڑیوں کی لمبی قطار دکھائی دی کہ یہاں آنے والوں کو۔۔۔مختلف (Beaches)اور پہاڑی بنگلوں کی سیر کو جانے کے لیے گاڑی بک کرانا ہی پڑتی ہے۔

افضال نے ایک منی وین والے سے بھاؤ تاؤ کیا اور دودن کے لئے گاڑی کے جملہ حقوق حاصل کر لئے۔پینکور جیٹی سے ہمارا ہوٹل دس منٹ کی مسافت پر تھا۔ہم نے سامان رکھا۔۔۔کافی پی اور تازہ دم ہو کر (Pasir Bogah Beach) چلے آئے۔جہاں سمندر تو اس کڑی دھوپ میں دم سادھے پڑا تھا جب کہ۔۔۔چھوٹی چھوٹی کشتیاں پانی میں ہلچل مچائے ہوئے تھیں۔بائیں طرف سینگ نما لمبی ڈبل چونچ والے ان گنت پرندے کھیل تماشے کر رہے تھے۔اس نایاب پرندے ہارن بل (Horn Bil) کی ایک جھلک میں نے کوالالمپور کے برڈ

پارک میں دیکھی تھی مگر یہاں تو۔۔۔۔ مجھے ان گنت چھوٹے بڑے ہارن بل نظر آرہے تھے جو برقی تاروں پہ۔۔۔۔ قلابازیاں کھاتے اور کرتب دکھاتے تھے۔ جب ساحل پہ موجود لوگ ان کی تواضع کرنے کو کیلے ان کی طرف اچھالتے تو وہ۔۔۔۔ برق رفتاری سے کیلا اُچکتے اور دعوت شیراز کے مزے لوٹتے کچھ لاڈ پیار میں بگڑے ہوئے ہارن بل کھانے کی بجائے کیلے کُتر کُتر کے نیچے پھینکتے جاتے تھے اور پھر شرارتی آنکھوں سے دیکھتے تھے تو ساحل کی فضا پہ شوخیاں بکھیر دیتے تھے۔ اس Pasir Bogah کے ساحل پہ سمندر کے بیچ۔۔۔۔ کچھ فاصلے پر ایک دو چٹانیں دکھائی دیتی تھیں جو جانے کب سے۔۔۔۔ اس محاذ پہ ڈٹی کھڑی تھیں اور لہروں کے ظالم تھپیڑے کھا کر بھی ٹس سے مس نہ ہوئی تھیں۔ سرکش لہریں ان پہ اپنے جوشیلے نقش تو ثبت کر جاتی تھیں پر ان کے حوصلے پست نہیں کر پاتی تھیں۔ بہت سے جیالے پانی پہ چلتے ہوئے یہ چوٹی سر کر لیتے تھے اور اوپر کھڑے ہو کر تصویریں بناتے تھے۔ ہم نے بھی ہمت کر کے ایک چٹان تک تو رسائی حاصل کر لی تھی مگر اُترائی نے۔۔۔۔ بچپن کی یاد دلا دی تھی جب اپنے گاؤں کے درختوں پہ چڑھ کے۔۔۔۔ پھل توڑنا معمول کی بات تھی۔ ابا جان سمجھا کے ہمیں باغ میں لے کر جاتے تھے کہ۔۔۔۔ خود کوئی پھل نہیں توڑنا۔ مالی بابا سے مانگ کے لے لینا مگر ہم سب بچے۔۔۔۔ آنکھ بچا کے یہ مہم سر کر لیا کرتے تھے۔ یہ تو خیر پرانی بات تھی کہ بچپن تو بے خوف ہوا کرتا ہے جب کہ ادھیڑ عمری خوف کے گجر بجاتی ہے۔ میرے لئے اس چٹان سے اترنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نیلے پانیوں اور آسمان کی نیلائیوں کے بیچ کھڑی تھی اور پتھروں کا سہارا لیتی ہوئی۔۔۔۔ اُترائی کا سفر طے کر رہی تھی کہ ذہن میں یاد کی لپک سی کوندی۔

غارِ حرا تک آتے جاتے تو ذرا بھی ڈر نہیں لگا تھا۔ وہ رحمتوں والا رستہ آپ ہی آپ طے ہوتا گیا تھا۔ اس بابرکت سفر کے تصور نے مجھے سنبھالا دیا اور میں۔۔۔۔ دھیرے دھیرے چٹان سے پانی میں اتر آئی۔ اب ہماری منزل اپ ٹاؤن بیچ ریزورٹ (Uptown Beach

(Resort) تھی۔ یہاں موٹی چینی کی طرح دانے دار ریت نے دھوپ کا لبادہ زیب تن کر کے ---ساحل پہ اک سنہری چادر بچھا رکھی تھی۔ جس نے---ساحل اور سمندر کے بیچ ایک سرحد بنا دی تھی۔

ملائیشیا کو سنہری جزیرہ ٹھیک ہی کہا تھا Ptolemy نے! میں نے اس یونانی جغرافیہ دان کو سراہا۔

سچ مچ ہر طرف سونا ہی سونا بکھرا تھا۔

یہاں پینکور آئس لینڈ ایسا جزیرہ ہے جس کے---صاف ستھرے پرسکون ساحل اپنا طلسم دکھاتے ہیں اور اس کی گولڈن براؤن ریت دیکھنے والوں کو مبہوت سا کر جاتی ہے۔ جہاں دھوپ سمندر کے نیلگوں پانی پہ اپنی چمکیلی چادر بچھا دیتی ہے اور جنگلوں کا کائی زدہ عکس جب ---اس پانی میں اترتا ہے تو اسے بھی زمرّدیں کر دیتا ہے۔

پینکوز کے اس قدیم ساحل پہ بنانا بوٹس (Banana Boats) کی کثرت تھی اور بندروں کی بہتات تھی جو---ایک درخت سے دوسرے درخت تک جھولتے ہوئے پانیوں کا سفر طے کرتے تھے اور جب---بپھری لہریں چنگھاڑتی تھیں تو یہ ڈر کے دبک جاتے تھے۔

سورج اب واپسی کا رستہ لینے کو تھا اور ہم اس پہاڑی بنگلے پہ چلے آئے تھے جہاں میں نے---دنیا کا سب سے بڑا پھول دیکھا اور خدا کی قدرت کو سراہا۔

ریفلیشیا (Refflesia) بنا جڑ---بنا پات کے---بنا ٹہنی---بنا شاخ کے یہ بڑے سائز کا پھول---آنکھ کے بند پپوٹوں کی طرح کھلتا تھا اور کھل جاتا تھا۔ یہاں اتنا سکون تھا کہ خاموشی بھی باتیں کرتی محسوس ہوتی تھی۔ لہریں بے چین تھیں---ریت ساکن تھی---خاموش جنگل تھا اور دنیا کے مختلف خطوں کے لوگ تھے---جن کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔ یہاں اتنا سکون تھا کہ شام سے رات اتر آئی تھی مگر جی نہیں چاہا تھا---واپس پلٹنے

کو۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے سمندر نے سیاہ اوڑھنی تان لی تھی۔ دور کہیں پانیوں میں ٹمٹماتے دیے زندگی کا پتہ دیتے تھے اور آسمان پہ چمکتے تارے پانی میں اترتے نظر آتے تھے۔ اب رفتہ رفتہ لوگ واپسی کی راہ لینے لگے تھے۔ جی نہ چاہنے کے باوجود ہم اس (Chalet) سے نکلے اور فائز ہوٹل (Faez Hotel) چلے آئے۔

خطِ استوا کے قریب سے گزرتے اس دیس میں بارش من مرضیاں کرتی تھی۔ جب چاہے برس جاتی تھی۔

ابھی ہم ہوٹل پہنچے بھی نہیں تھے کہ بارش نے آلیا۔ چھتریاں تانے ہم اپنے کمروں تک آئے۔ میں نے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ پانی سے گھری اس بستی میں اب ہُو کا عالم تھا۔ تھکن اور نیند دونوں بے حال کئے ہوئے تھیں مگر جونہی آنکھ لگتی تھی۔۔۔۔ بارش کی بوندیں شیشوں پہ دستک دیتے ہوئے کہتی تھیں

۔۔۔۔ دیکھو سونا نہیں! یہ منظر اپنی آنکھوں میں بھر لو۔

بوندوں کے جلترنگ کو سن لو کہ۔۔۔۔ بار بار کون آتا ہے یہاں؟

صبح آنکھ کھلتے ہی میں پھر کھڑکی سے آ لگی تھی۔

فائز (Faez) ہوٹل کے کمرے کی یہ کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی تھی۔ سمندر کے اندر طلوع ہوتے سورج کی کرنیں دل کو اپنی گرفت میں لیتی تھیں اور۔۔۔۔ دور تک پھیلا پانی جب مچلتا تھا تو نیلے سے ہرا دکھائی دینے لگتا تھا۔ تب دور ماضی کی گپھا میں چھپا یہ کھیل۔۔۔۔ یاد آجاتا تھا۔

ہرا سمندر گوپی چندر۔۔۔۔ بول میری مچھلی کتنا پانی۔

چھٹی کے دن ہم سب مل کے یہ گاتے تھے اور کھیلتے تھے۔

آئے بادل چلی ہوا
جاگے پھول سجیں بیلیں
آج ہماری چھٹی ہے
چھٹی کے دن کیا کھیلیں

ہرا سمندر گوپی چندر
بول میری مچھلی کتنا پانی
اپنے دل میں اتنی ہمت
بیچ سمندر جتنا پانی

کوڑا جمال شاہی
پیچھے دیکھا مار کھائی
ہنستے بستے ہنسی خوشی
کھیلیں بہنیں، کھیلیں بھائی

میں نے دیکھا یہ ہرا سمندر دل وجاں کو سکون بخشتا تھا۔ دور سطح سمندر پہ لیٹی کشتیاں پانی سے ہم آغوش ہونے کو بے تاب ہوئی جاتی تھیں۔ ملاح اپنے لئے مسافر تلاش کرتے تھے اور گورے۔۔۔کالے۔۔۔اور ہم سے بہت سے دیوانے چاندی جیسے پانی پہ سنہری کرنوں کا جال بچھتے دیکھتے تھے تو مستانے ہوئے جاتے تھے۔ لہروں کی بے تابی دل کا اضطراب بڑھاتی تھی اور۔۔۔مچلتی لہریں جب ساحل سے ٹکرا کر پلٹتی تھیں تو میری آنکھیں۔۔۔ان کا پیچھا

کرتی دور تک چلی جاتی تھیں جہاں۔۔۔۔گھنے جنگلوں کا عکس میری توجہ اپنی طرف کر لیتا تھا۔

ناشتہ کرنے کے بعد ہمیں (Dutch Clonial Fort) جانا تھا۔ بوسیدہ دیواروں اور بھر بھری سی ہوئی اینٹوں والا یہ قلعہ جسے سترھویں صدی کی ساتویں دہائی میں تجارتی اغراض و مقاصد کے لیے بنایا گیا تھا۔ اب بھی یہ قلعہ اپنی باقیات کے ساتھ کھڑا تھا اور اپنے ماضی کی کہانی سنا رہا تھا۔ حصول اقتدار کی جنگ کے بھید کھولتا یہ قلعہ 1670ء میں ولندیزیوں نے بنایا اور 1690ء میں۔۔۔۔ملائیوں نے اسے گرا دیا اور اس کی دوبارہ تعمیر 1743ء میں کی گئی جہاں۔۔۔۔1748ء تک سپاہی تعینات رہے۔ 1874ء میں برطانوی حکومت اور ریاست پیراک کے مابین ایک معاہدہ طے پا گیا۔ آزادی کے بعد اس قلعے کو ملائیشین حکومت نے دوبارہ تعمیر کرایا۔ اس قلعے کے سامنے ایک چھوٹا سا پارک تھا اور کچھ دکانیں۔۔۔۔جن میں سوینئرز اور کھانے پینے کی اشیاء موجود تھیں۔

قلعے کی داستان سننے کے بعد پینکور کا چائنہ ٹاؤن دیکھا جہاں۔۔۔۔کلر فل دکانیں تھیں۔۔۔۔ایک خوبصورت بازار کا رنگین منظر تھا۔ صد شکر بچوں نے یہاں کچھ خریدنے میں وقت نہیں گنوایا کہ خریداری تو کہیں سے بھی کی جا سکتی تھی مگر اس حسین بستی کے۔۔۔۔اس شہر آب کے ساحلی نظارے ملنا ممکن نہیں تھے۔ قریب ہی تاؤ مذہب کا ایک ٹیمپل تھا۔ اسے بھی دیکھا۔۔۔۔جہاں بدھا کے مجسمے تھے۔ مختلف مذہبی نشانیاں تھیں۔ بچے اس آئس لینڈ کے سب سے اونچے پوائنٹ تک جانے کا ارادہ رکھتے تھے جب کہ میں ساحل کی ہواؤں سے مستفید ہونے کی خواہش دل میں رکھتی تھی۔ ہوٹل ہم چھوڑ چکے تھے۔ گاڑی ہمارے پاس تھی۔ اب ہم نے Teluk Nipah Beach کا رُخ کیا جو۔۔۔۔پینکور آئس لینڈ کی خوبصورت بیچ کہلاتی ہے۔ یہاں دور تک دانے دار ریت چمکتی تھی اور اپنی خوشنمائی کی گواہی دیتی تھی۔ صاف ستھرا ساحل تھا اور بہت دلفریب منظر تھا۔ اس پہ ہوائیں منہ زور اور گھٹائیں پرشور تھیں۔

بجلی کڑکتی تھی اور بارش برستی تھی۔ یہ میری زندگی کی قیمتی دوپہر تھی۔ موسم اور مناظر فطرت اپنے حصار سے نکلنے ہی نہ دیتے تھے۔

کتنے ہی گھنٹے ہم نے اس ساحل پہ گزار دیے کہ وینکوور کی اس آخری سیرگاہ سے مستفید ہونے کے بعد ہمیں واپس پلٹنا تھا۔ بچے گھومتے پھرتے رہے۔۔۔۔ کشتی کی سیر کرتے رہے اور میں ریت پہ پھسکڑا مارے۔۔۔۔ سمندر کی دل فریبیاں دیکھتی رہی جو۔۔۔۔ کبھی بے چین ہو کر اتنا اُچھلتا تھا کہ لہریں۔۔۔۔ ساحل پہ بیٹھے ہوؤں کو بھی شرابور کر جاتی تھیں اور کبھی اتنی خاموشی اوڑھ لیتا تھا کہ دھڑکنوں کی دھک دھک بھی۔۔۔۔ اس پرسکون سناٹے میں صاف سنائی دیتی تھی۔ شام دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ چوٹیوں پہ سنہری دھوپ اپنا آخری لپکا دکھا رہی تھی۔ درختوں کی گہری سبز چھاؤں پانی پہ اپنا سیاہی مائل سبز آنچل پھیلائے ہوئے تھی۔ میں نے روشنی اور تاریکی کے اس حسین امتزاج کو جی بھر کے دیکھا اور یقیناً آخری بار ہی دیکھا کہ۔۔۔۔ کانوں میں گونجتے ایک پرانے گیت کے بول اس کی گواہی دے رہے تھے۔

زندگی کے سفر میں گزر جاتے ہیں جو مقام
وہ پھر نہیں آتے۔۔۔۔ وہ پھر نہیں آتے

بکت بن تانگ اور چائنا ٹاؤن

جولائی کے مہینے میں کوالالمپور میں پھولوں کا طوفان اُمڈ آتا ہے۔ مختلف مقامات پر پھولوں کی نمائش لگ جاتی ہیں اور۔۔۔ رنگ برنگے پھول ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ اب کے ہم پھولوں کے اسی طوفانی موسم میں کوالالمپور آئے تھے۔

یہ پروگرام اچانک ہی بنا تھا کہ۔۔۔۔ کچھ الجھی ہوئی گتھیاں مل بیٹھ کے سلجھانا ضروری ہوگئی تھیں۔

ابھی کچھ ہی دن پہلے ہمارے داماد کی کوششوں سے۔۔۔ ان کے کچھ عزیز اور محلے دار حصول روزگار کے لیے ملائیشیا پہنچے تھے۔ واجبی سی تعلیم والے یہ دیہاتی نوجوان۔۔۔۔ شاید ہاتھ بڑھا کر درختوں پہ لگے ہوئے نوٹ اتارنے کا تصور لے کر ملائیشیا آئے تھے اور اب یہاں بارِ مشقت سے گھبرائے ہوئے تھے۔ یہ کبھی افضال کو فون کر کے اپنی رودادِ مشکلات سناتے تھے اور کبھی۔۔۔۔ اپنے گھر والوں سے وطن واپس بلا لینے کی فریاد کرتے تھے جب کہ گھر والے۔۔۔۔ ان کی اس فریاد پہ کان ہی نہیں دھرتے تھے کہ اگر بنا کچھ کمائے یہ وطن واپس لوٹ آئے تو انہیں پردیس بھیجنے کے لیے لیا گیا لاکھوں روپے کا قرض کون اتارے گا؟

لہذا ان نوجوانوں سے ایجنٹ کی موجودگی میں ملاقات ضروری ہوگئی تھی اور ساتھ ہی ایک پنتھ دو کاج کے مصداق تعبیر (نواسی) کے پاسپورٹ بنوانے اور مجھے۔۔۔۔ اس جدتوں

بھرے شہر کی کچھ اور سیر کرانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ اب کے ہم نے ٹرین سے کوالالمپور جانے کا پروگرام بنایا تھا۔

باتو گا جا ریلوے اسٹیشن ہم وقت پر پہنچ گئے تھے۔ اپنی گاڑی افضال نے ریلوے اسٹیشن کی پارکنگ میں لگائی اور ہم ۔۔۔ چھوٹے سے صاف ستھرے پلیٹ فارم پہ کوالالمپور جانے والی ٹرین کا انتظار کرنے لگے ۔ وقت مقررہ پہ ساؤنڈ لیس ٹرین آئی اور بنا شور مچائے مسافروں سمیت کے چلتی بنی۔ ملائیشیا میں ٹرین سے یہ پہلا سفر میرے لئے اک خوشگوار تجربہ تھا۔ آٹومیٹک دروازے ۔۔۔ آرام دہ نشستیں ۔۔۔ ایل سی ڈی کی سہولت سے مزین ائر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ ۔۔۔ ہائی سٹینڈرڈ واش روم جن میں ۔۔۔ ٹشو پیپر اور ہینڈ واش ۔۔۔ ائر فریشنر تک موجود تھے۔ باہر دھوپ چمک رہی تھی اور اندر کا ماحول خاصا ٹھنڈا تھا۔ میں دوڑتے بھاگتے ہریالی بھرے مناظر دیکھتی رہی اور ٹرین سبک خرامی کے ساتھ رستوں سے آنکھ مچولی کھیلتی رہی۔

یہ ٹرین ٹھیک گیارہ بجے ہمیں کوالالمپور منزل لے آئی تھی۔

جدید سہولتوں سے آراستہ اس ماڈرن ریلوے اسٹیشن کی اندرونی عمارت پہ ائرپورٹ کا گمان گزرتا تھا۔ بھول بھلیوں کی طرح ادھر ادھر ۔۔۔ بہت سے راستے نکلتے تھے جو مختلف پلیٹ فارم تک جا پہنچتے تھے۔ جن پہ ۔۔۔ دنیا کے مختلف ملکوں سے آئے ہوئے طالب علموں، تاجروں، نو بیاہتا جوڑوں اور ادھیڑ عمر لوگوں کی کثیر تعداد دکھائی دے رہی تھی کہ یہاں لوگ ۔۔۔ زیادہ تر سیاحت، تجارت اور تعلیم کی غرض سے آتے ہیں۔

ہمیں یہاں سے مونوریل پہ سوار ہونا تھا۔ جس کا ٹکٹ لینے کے لیے چار رنگٹ (مقامی کرنسی) کا سکہ ٹکٹنگ مشین میں ڈالا گیا تھا اور ۔۔۔ جوابی کاروائی میں مشین نے پلاسٹک کوائن بڑھا دیا تھا جسے ۔۔۔ مونوریل کے گیٹ پہ لگاتے ہی واک تھرو گیٹ کھلا اور ہمارے اندر قدم دھرتے ہی ۔۔۔ بند ہو گیا۔ اندر کی فضا پرسکون سی تھی ۔ کچھ مسافر بیٹھے تھے ۔۔۔ کچھ کھڑے

تھے۔کوئی کتاب اور اخبار کے مطالعے میں گم تھا اور کوئی۔۔۔۔لیپ ٹاپ کی دنیا میں کھویا ہوا تھا ۔ہمیں کھڑا دیکھ کر دو جوان اٹھے اور اپنی سیٹیں مجھے اور ارم کو پیش کر دیں۔ ہر اس احساس اس احترام پر جی خوش ہوا اور دل سے۔۔۔۔بہت سی دعائیں نکلیں اس معاشرے کے افراد کی عمدہ تربیت پر کہ۔۔۔۔منٹوں کا ساتھ بھی دیرپا نقش ثبت کر گیا تھا۔

اس مونو ریل نے ہمیں بدو رائے اسٹیشن کے حوالے کر دیا جہاں سے ہم ۔۔۔۔بذریعہ ٹیکسی چائنا ٹاؤن پہنچ گئے کہ اس بار۔۔۔۔ہمارے قیام وطعام کا بندوبست ہوٹل چائنہ ٹاؤن ٹو میں۔۔۔۔آن لائن ہو گیا تھا۔مناسب دام اور مناسب آرام والے اس ہوٹل کی تیسری منزل پہ ہم کمرے میں کچھ دیر۔۔۔۔تازہ دم ہونے کو رکے اور پھر نیچے چلے آئے کیونکہ دو بجے ہمیں۔۔۔۔ماما ریسٹورنٹ پہنچنا تھا اور پاکستان سے آئے ہوئے جوانوں کی معہ ایجنٹ۔۔۔۔میزبانی کرنا تھی۔

ہمارے ریسٹورنٹ پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد وہ ایجنٹ معہ بیگم تشریف لے آیا جس کے توسط سے۔۔۔۔ہمارے یہ جوان ملائیشیا آئے تھے۔چالیس کے لگ بھگ یہ ایجنٹ وہی ظفر تھا جس کی والدہ سے۔۔۔۔ملائیشیا آنے سے پہلے افضال کے کہنے پر میں ملنے گئی تھی کہ ظفر کی والدہ نے اپنے بیٹے کے لیے کچھ پاکستانی سوغاتیں بھیجنا تھیں۔

ظفر کی ماں بھی عام روایتی ماؤں جیسی مشرقی ماں تھی جس نے بیٹے۔۔۔۔کو یاد کرتے ہوئے میرے سامنے بہت سے آنسو بہائے تھے اور پھر جھولی پھیلا کر اس کی ملائیشین بیوی کو ڈھیروں ڈھیر بددعائیں دی تھیں کہ۔۔۔۔بقول اس کے اس جادوگرنی نے اپنے جال میں پھانس کے اس کے بھولے بھالے بیٹے کو ماں سے دور کر دیا تھا۔

ساری مائیں شاید ایسی ہی ہوتی ہیں۔محبت سے لبالب بھری ہوئی۔
ممتا کی سولی پہ لٹکی ہوئی۔

جنہیں اپنی اولاد کی خامیاں بھی خوبیاں نظر آتی ہیں۔اب ظفر اور اس کی بیوی سے ملاقات نے وہ سارے ابہام دور کر دے تھے۔اس ملائیشین جادوگرنی نے تو پردیس میں اس کے بیٹے کو سہارا دیا تھا۔۔۔اس کی کفالت کی تھی اور۔۔۔اپنا آپ بھی اسے سونپ دیا تھا۔ نوّے کی دہائی میں جب ظفر یتیمی کا کشٹ کاٹتا۔۔۔محنت کش ماں کی بے چارگی پہ دل ملول کرتا ہوا۔۔۔اپنا اور اپنی ماں کا مستقبل بنانے کو غیر قانونی طریقے سے کنٹینروں میں چھپتا چھپاتا۔۔۔تھائی لینڈ کے ساحلوں سے ملائیشیا کی طرف دھکیلا گیا تھا تو اس بھوکے پیاسے ظفر کو۔۔۔ستیندرا نے ہی پناہ دی تھی اور۔۔۔یہاں قدم جمانے میں اس کی مدد کی تھی۔بوٹا سے قد کی ستیندرا۔۔۔تب ظفر کے لیے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ثابت ہوئی تھی اور اب وہ آسودہ حال تھا اور اپنی ٹریول ایجنسی چلا رہا تھا۔ستیندرا ٹوٹی پھوٹی اردو میں شامل گفتگو تھی۔

مجھے اس پہ ترس آنے لگا

اس کی وفاشعاری پہ پیار آنے لگا،جو تن من دھن کی بازی لگا کے بھی وُہ پاکستانی ساس کے دل میں اپنی جگہ نہیں بنا پائی تھی کہانی شاید کچھ اور آگے بڑھتی مگر۔۔۔ان چاروں جوانوں کے آتے ہی تندوری چکن اور نان ہم سب کی زبان بندی کر گئے تھے۔

بیس پچیس برس کی عمر کے یہ چاروں جوان دیکھنے میں تو معقول ہی لگتے تھے مگر ان میں سے ایک کی نامعقولی سب کا دل اچاٹ کر گئی تھی۔یہ نوجوان رشتے میں افضال کا داماد لگتا تھا۔انٹر پاس تھا اور باقی لڑکوں میں خود کو زیادہ پڑھا لکھا جان کے۔۔۔اندھوں میں کانا راجہ بنا بیٹھا تھا۔اب باقی تینوں تو ہمارے سمجھانے بجھانے پہ حالات سے سمجھوتہ کر گئے تھے مگر یہ۔۔۔اپنی دامادی دکھانے پہ تُلا تھا۔اونچ نیچ سمجھانے کے باوجود اس کی ایک ہی رٹ تھی مجھے واپس جانا ہے۔

مجھے اس دیس میں نہیں رہنا۔

میں سوچ رہی تھی ۔۔۔۔کیسا اڑیل انسان ہے یہ؟۔۔۔۔۔پیسہ اور وقت ضائع کر کے بھی اس دیس کا حسن دیکھے بغیر واپس جا رہا ہے۔

اپنے تئیں میں نے بھی یہ کہہ کر اسے قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔

بھئی! نہ کرو محنت مزدوری مگر آئے ہو تو۔۔۔۔کچھ سیر ہی کرتے جاؤ۔کون آتا ہے بار بار؟

میری بیٹی اور داماد نے بھی اس نازک رشتے کو نباہتے ہوئے اصرار کیا کہ کچھ دن ہمارے ساتھ رہ لو۔۔۔۔یہاں گھوم پھر کے رونق دیکھو مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہی نکلا تھا۔لہٰذا اگلے روز اس کی واپسی کی سیٹ کرا دی گئی اور چائنہ ٹاؤن کی سیاحوں سے بھری پیٹالینگ سٹریٹ سے۔۔۔۔ایک احمق پاکستانی نوجوان کے بنا سیاحت کے واپسی کا مسئلہ حل کر دیا گیا۔ یوں ہم تین سے چار ہو گئے کہ اب۔۔۔۔کل تک وہ ضدی داماد ہمارے ساتھ تھا اور ہمیں ہی اسے پاکستان روانہ کرنا تھا۔

پیٹالینگ سٹریٹ کے مزیدار فرائز اور پین کیک کھانے کے بعد ہم سنٹرل مارکیٹ چلے آئے جو۔۔۔۔یہاں سے قریب ہی تھی۔ 1888ء میں وجود میں آنے والی یہ مارکیٹ ۔۔۔۔اب یہاں کا ثقافتی ورثہ قرار دی گئی تھی۔ جہاں دورویہ دکانیں تھیں۔مکمل ائر کنڈیشنڈ اس سنٹر مارکیٹ میں اس وقت تل دھرنے کی جگہ نہ تھی کہ سر شام۔۔۔۔یہاں دکانیں بند کر دی جاتی ہیں۔ہم نے یہاں کی Old Town White کافی کی بہت تعریف سنی تھی جو۔۔۔۔غلط نہ تھی ۔دام مناسب تھے اور ذائقہ بھی عمدہ تھا۔کافی سے لطف اندوز ہو کر ہم نے سنٹرل مارکیٹ کا ایک چکر لگایا۔بس طائرانہ سی نظر ڈالی اور یہیں سے۔۔۔۔سنٹرل مارکیٹ فوڈ کورٹ کی طرف مڑ گئے جہاں شام اترتے ہی۔۔۔۔سڑک کنارے میزیں لگا دی جاتی ہیں۔ صاف ستھری فضا اور مناسب داموں میں یہاں عمدہ کھانا مل جاتا ہے۔ہم کافی دیر اس فوڈ سٹریٹ میں بیٹھے اپنے

لاہور کی فوڈ سٹریٹ کو یاد کرتے رہے۔ ماحول اچھا تھا۔ کھانا بھی اچھا تھا۔ مگر وہ کہتے ہیں نا کہ ۔۔۔۔۔لاہور لاہور ہے اور اپنے اس شہر کا سحر ہم کہیں بھی چلے جائیں ۔۔۔۔ ہمارے ساتھ رہتا ہے۔

ناشتے کے لیے ہم تامل چنائی آئے تھے۔ جہاں یوں لگتا تھا جیسے ۔۔۔۔ مفت لنگر تقسیم ہو رہا ہو۔ تامل ۔۔۔۔ مسلم ۔۔۔۔ انڈین ۔۔۔۔ سکھ ۔۔۔۔ ہندو سب یہاں روٹی چنائی سے ناشتہ کر رہے تھے جن میں ۔۔۔۔ عورتوں کی تعداد بھی کم نہ تھی میں نے تامل مسلم ویٹر سے پوچھ ہی لیا کہ آج کوئی خاص بات ہے کیا؟ یا یہاں ہمیشہ ہی ایسے رش لگا رہتا ہے۔

میم ۔۔۔۔ ویٹر نے جواب دیا۔ یہاں زیادہ تر عورتیں ورکنگ ہیں۔ اس لئے بہت سے لوگ یہاں فوڈ سٹریٹ سے ۔۔۔۔ من پسند ناشتہ کر کے کام پہ نکل جاتے ہیں اور رات کو واپسی پہ بھی ۔۔۔۔ کھانا کھا کر اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ ویٹر کا یہ جواب مجھے حیرت میں ڈال گیا تھا۔

تو کیا یہ گھر صرف سونے کے لیے جاتے ہیں؟

یہ سوچ کے مجھے اپنے پاکستانی خاندانی جڑت والے گھرانوں پہ بہت پیار آیا تھا کہ جہاں اب بھی ۔۔۔۔ گھر کے سب افراد دستر خوان پہ مل بیٹھتے ہیں اور گھر کے بنے کھانے کھاتے ہیں۔ ہمارے جیسا مضبوط خاندانی نظام قسمت والوں کو ملتا ہے۔ ہمارے ہاں مرد اگر بادشاہوں کی سی زندگی گزارتے ہیں تو وہ بیوی کو بھی کنیز نہیں سمجھتے بلکہ ۔۔۔۔ ملکہ بنا کے رکھتے ہیں اور اس کے ناز نخرے اٹھاتے ہیں۔ اسے تحفظ اور احترام دیتے ہیں۔

یہ تامل چنائی ناشتہ حلوہ پوری اور دال بھات کی طرح کا تھا۔ ناشتے کے بعد افضال اور وہ نوجوان ۔۔۔۔ ہمیں ہوٹل چھوڑ کے اپنے مشن پہ روانہ ہو گئے کہ پہلے انہیں ۔۔۔۔ تعبیر کے پاسپورٹ کے لیے پاکستان ایمبیسی جانا تھا اور پھر ۔۔۔۔ اس نوجوان کو ائر پورٹ چھوڑنا تھا۔ ہم

دونوں ماں بیٹیاں کچھ دیر باتیں کرتی رہیں اور پھر پتہ ہی نہیں چلا کب سوگئیں کہ یہاں کرنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔سونیند نے غلبہ پالیا تھا۔

افضال آئے تو ہم کھانا کھانے Kasturi Walk چلے آئے جہاں۔۔۔ہم نے ناسی لیمک۔۔۔چکن کری اور بنانا فرائز کھائے اور پھر آئس کافی پیتے ہوئے اگلا پروگرام ترتیب دینے لگے کہ اب ہمیں صرف سیر ہی کرنا تھی۔باقی سب کام تو ہو گئے تھے۔

چائنہ ٹاؤن میں اس وقت بھی ہر رنگ۔۔۔ہر نسل کا بندہ دکھائی دیتا تھا۔

کبھی اس تجارتی مرکز میں چینی چھائے ہوئے تھے جو۔۔۔ٹن کی کھوج میں یہاں آئے تھے اور پھر یہیں کے ہو کے رہ گئے تھے یوں بھی چین اور ملائیشیا کے تعلقات کی تاریخ کئی صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔چینی تاجر عرصہ دراز سے ملاکا کی بندرگاہ پر آتے اور سامان لاتے جاتے رہے تھے۔یہ چائنہ ٹاؤن چینیوں کی نگری ہے۔تاریخ بتاتی ہے جب برصغیر کی طرح ملائیشیا بھی۔۔۔برطانوی کالونی بنا رہا تو اسی دور میں چین اور ہندوستان سے بڑی تعداد میں تارکین وطن یہاں آباد ہوئے حکمرانی تو انگریز نے کی کیونکہ اکثریت میں ہونے کے باوجود ملائی قوم کی اکثریت۔۔۔ناخواندہ تھی اور غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور تھی۔اس لئے سرکاری عہدوں پر چینی اور ہندوستانی چھائے ہوئے تھے۔ 1957ء میں جب ملائیشیا۔۔۔برطانوی قبضے سے جان چھڑا کے فخر سے سر اٹھا کے جینے لگا تو چینی یہ۔۔۔برداشت نہ کر پائے۔ 1961ء میں ملائی اور چینی قوم میں ایسے خونریز فسادات ہوئے جس نے۔۔۔پورا ملک مفلوج کر ڈالا۔تب اس وقت کے وزیراعظم تن رزاق کی قیادت میں دیانتدارانہ مردم شماری کرا کے ملک میں آباد قوموں کا تخمینہ لگایا گیا اور پھر اسی تناسب سے۔۔۔ہر شعبے میں ان کا حصہ متعین کر دیا۔چینیوں کو اپنے کاروبار میں۔۔۔ملائی لوگوں کو بیس فیصد حصہ دار کا پابند کیا۔۔۔پوری ملائی قوم کیلئے تعلیم مفت کر دی گئی جس نے۔۔۔اعلیٰ ذہنوں کو نکھار دیا اور تعلیم

کی شرح بڑھ گئی تبھی یہ پڑھے لکھے لوگ ۔۔۔کاروباری میدان میں بھی آگے آ گئے تھے۔
مہاتیر محمد اس وقت ۔۔۔وزیر اعظم تن رزاق کی کابینہ میں وزیر مملکت برائے منصوبہ بندی تھے۔انہوں نے جاپان سے رابطہ کیا اور جاپان جو اس وقت اپنی چھوٹی صنعتیں ترک کر رہا تھا ۔مہاتیر محمد نے ان صنعتوں کو۔۔۔ملائیشیا منتقل کرانے کا جاپان سے معاہدہ کر لیا اور اس طرح ملائیشیا میں الیکٹرک مصنوعات کی بہت سی فیکٹریاں لگ گئیں اور ملائیشیا مضبوط ہوتا چلا گیا۔
مہاتیر محمد جب 1981ء میں وزیر اعظم منتخب ہوئے تو ان کے دور میں ۔۔۔ملائیشیا ایک کامیاب معیشت بن کے ابھرا اور ایشین ٹائیگر بن گیا۔

ملائی قوم کی خوش نصیبی رہی کہ اسے ۔۔۔مہاتیر محمد جیسا حکمران میسر آیا۔مہاتیر محمد 1964ء میں ۔۔۔یونائیٹڈ ملائی نیشنل آرگنائزیشن میں شامل ہوئے۔۔۔1970ء میں کابینہ کا حصہ بنے۔۔۔1974ء میں وزیر تعلیم اور 1976ء میں ۔۔۔نائب وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ 1981ء میں مہاتیر محمد نے وزارتِ عظمٰی کا عہدہ سنبھالا اور پورے بائیس برس تک ۔۔۔ہر ملکی انتخاب میں جیت مہاتیر محمد کا مقدر بنی۔وہ اک طویل مدت سیاست میں رہ کر بغیر کسی بدعنوانی کا داغ لئے ۔۔۔2003ء میں باعزت مستعفی ہو گئے اور دنیا کے نقشے پر ۔۔۔ملائیشیا کو ایک مضبوط، منظم اور مستحکم ملک کا حوالہ دے گئے۔

میں نجیب رزاق کے دور میں یہاں آئی تھی مگر لوگ اب بھی ۔۔۔مہاتیر محمد کے گن گاتے تھے اور اس کی حکمت عملی کو سراہتے تھے۔جس کی وجہ سے اس ملک نے حیرت انگیز ترقی کی اور ۔۔۔جنگلوں، پہاڑوں، ٹیلوں، ڈھلوانوں والا یہ ملک ۔۔۔جو کبھی زیرو ہوا کرتا تھا ۔۔۔ہیرو بن گیا۔اب ہم جہاں بھی جاتے تھے۔سلام، ستو، ملائیشیا شاہراؤں پہ کا نعرہ لکھا ہوا پاتے تھے بازاروں میں ۔۔۔ساحلوں پہ ۔۔۔پہاڑوں پہ یہی لفظ کندا ملتے تھے حتیٰ کہ پھولوں کی اس نمائش میں بھی ۔۔۔جگہ جگہ بورڈ پر یہی تحریر تھا اور یہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ایک ماہ

سے زیادہ ہو گیا تھا مجھے یہاں آئے ہوئے۔ میں نے ہر لحاظ سے اس ملک کو۔۔۔۔نمبرون ہی پایا تھا۔

چلتے چلتے یونہی کچھ دیر کو ایک محرابی چھتوں اور سرخ ستونوں والے ٹیمپل (Chan See Shu yuan) کو نظروں میں بھر لیا۔ یہ بدھست ٹیمپل۔۔۔۔1897ء میں بنا تھا۔ اپنی سجاوٹ کے زور پر یہ ہمیں روکنے کی تگ و دو میں تھا مگر ہم۔۔۔۔اس کی خوبصورتی۔۔۔۔صفائی اور سجاوٹ کو سراہتے ہوئے آگے بڑھ گئے کہ ہمیں ابھی۔۔۔۔کچھ اور گھومنا تھا۔۔۔۔کچھ اور دیکھنا تھا۔ بکت بن تانگ جانا تھا اور وہ فوارہ دیکھنا تھا جس میں۔۔۔۔ملائیشیا میں رہنے والی مالے، چینی اور ہندوستانی تینوں قوموں کی نمائندگی کرتے پیالے سجے تھے اور ان پیالوں میں لگے۔۔۔۔ملائیشیا کے قومی پھول (Habiscus) کے دیدار بھی تو کرنا تھے۔

بکت بن تانگ (Bukit Bin Tang) کے عین وسط میں ایک بڑا سا فوارہ نصب تھا جس کے گرد تین پیالے بنے تھے۔ جس میں ہے بکس (Hebicus) کے پھول لگے ہوئے تھے۔ یہ فوارہ اس ملک کے کثیر الثقافتی معاشرے کی عکاسی کر رہا تھا اور یہ تین پیالے۔۔۔۔اس ملک میں آباد مالے، چینی اور ہندوستانی قوموں کی ہم آہنگی اور اتحاد کی علامت بنے تھے۔

ہم یہاں سے واپس پلٹے تو میں نے دیکھا مختلف شاہراہوں پر لگے قمقموں میں اسی قومی پھول کی شبیہہ اُبھر آئی تھی۔ پھول کی شکل والے قمقمے فانوسوں میں جل اٹھے تھے اور ان کے برابر۔۔۔۔غنچوں کی ساخت کے لیمپ شیڈز میں کلیوں کی طرح کھلی ہوئی چھوٹی چھوٹی بتیاں انسانی کمال وفن کا عمدہ نمونہ پیش کر رہی تھیں جو۔۔۔۔دیکھنے میں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔

ہم کتنی ہی دیر کوالالمپور کی صاف ستھری سڑکوں پہ پھرتے رہے۔ ٹیلوں اور گھاٹیوں والے اس دیس میں۔۔۔۔مُجھے صفائی ستھرائی ہر جگہ دکھائی دی تھی۔ نہ کہیں پھلوں کے چھلکے سڑکوں پہ بکھرے دیکھے تھے اور۔۔۔۔نہ ادھ جلے سگریٹ کے ٹکڑے نظر آئے تھے کہ یہاں

کے لوگ ۔۔۔صرف اپنے گھر کو ہی نہیں ،گلیوں ۔۔۔شاہراہوں اور پارکوں کو بھی صاف رکھنے کے پابند تھے۔یہاں کے لوگ مہنگی ترین گاڑیوں میں سفر کرتے ہوئے خالی ریپرز۔۔۔ پھلوں کے چھلکے گاڑی میں سے ہاتھ بڑھا کر باہر نہیں پھینکتے تھے۔اپنے ملک کی ۔۔۔اپنے شہروں کی ۔۔۔اپنی چیزوں کی حفاظت کرتے ۔۔۔اور پرانی عمارتوں کو سنبھال کے رکھنے کا ذوق بھی رکھتے تھے۔

لنکاوی کے دل فریب ساحل

سری اسکندر سے کولا کیڈہ (Kaula Kedah) جانے کے ہم رات گئے گھر سے نکلے تھے۔

پانچ گھنٹوں کا یہ بس کا سفر ہم نے سوتے جاگتے ہی گزارا تھا کہ بس کے باہر گھُپ اندھیرے کا راج تھا۔ دور ٹانواں ٹانواں روشنیاں آبادی کا پتہ دے جاتی تھیں اور بس کے اندر نیم تاریکی میں اونگھتے مسافر تھے اس لئے یہ سفر۔۔۔ اندر اور باہر کے اندھیروں کو جھیلتے گزرا تھا۔ پَو پھٹنے سے ذرا پہلے ہم کولا کیڈہ پہنچ گئے تھے مگر ہمارا یہ سفر ختم نہیں ہوا تھا کہ بقول منیر نیازی

ایک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

جبکہ ہمیں تو دریا کا نہیں۔۔۔ سمندر کا سامنا تھا۔ پہلے کیڈہ جیٹی جانا تھا اور پھر وہاں سے۔۔۔ اُس خوبصورت جزیرے تک جانے کے لیے فیری (Ferry) کا سفر کرنا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے۔

"جس نے لنکاوی نہیں دیکھی، اس نے ملائیشیا نہیں دیکھا"

اور میں جو اس ہرے بھرے دیس میں ایک مہینے سے گھومتی پھر رہی تھی بس۔۔۔ لنکاوی نہ جاسکی تھی اور نہ ہی جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

اب تو میں بس یہ چاہتی تھی کہ پاکستان واپسی سے پہلے۔۔۔۔مزید گھومنے پھرنے کی بجائے کچھ دن صرف اپنی بیٹی اور اس کی بیٹی کے ساتھ گھر میں رہوں۔۔۔۔جی بھر کے انہیں دیکھوں مگر۔۔۔۔

میرے دونوں لاڈلے پوت بضد تھے کہ اگر کچھ دنوں کے لیے قیام بڑھالیا ہے تو پھر ۔۔۔۔پانیوں میں گھرے اس جزیرہ الجزائر تک ضرور جائیں جس کے آس پاس ۔۔۔۔ننانوے چھوٹے بڑے جزیرے بکھرے ہوئے ہیں۔

میں نے ان کی بات سنی ان سنی کر دی تھی مگر۔۔۔۔

میری خاموشی پہ بڑے بیٹے نے اپنا بڑا پن دکھاتے ہوئے کہا!

امی جان کون جاتا ہے بار بار ان جگہوں پر؟ آپ خاندانی سیاح تو ہیں نہیں کہ جب جی چاہے۔۔۔۔جدھر جی چاہے چل دیں۔

چھوٹے نے بھی زور دیا! پیاری ماں رک گئی ہیں تو۔۔۔۔گھومیں پھریں۔۔۔۔خوب سیریں کریں۔

مگر میں پس و پیش کرتی رہی۔۔۔۔دلیلیں ہی دیتی رہی کہ

میرے بچوں۔۔۔۔جتنی سیر ممکن تھی کر لی۔۔۔۔

جتنا زادِ راہ لائی تھی سب خرچ چکی۔۔۔۔

لہذا میں اب کہیں نہیں جانے والی اور نہ۔۔۔۔کہیں جانے کی فرمائش کرنے والی۔

تمہیں تو خبر ہے کہ فرمائش اور ضد اب تمہاری ماں کی سرشت میں نہیں رہا۔ اپنے بچپن کے سنہرے دور کے بعد۔۔۔۔اپنے ماں باپ کے سوا تمہاری ماں نے کبھی کسی سے کچھ کہا اور ۔۔۔۔نہ کبھی کسی سے کچھ مانگا۔ حتیٰ کہ اس سے بھی نہیں۔۔۔۔جس کے ساتھ کئی دہائیوں سے سنگت ہے۔ مرحومہ امی جان کے نصیحت بھرے اس جملے نے

کہ فرمائشیں کرنے والی عورت شوہر کے دل سے اتر جاتی ہے

کبھی کچھ کہنے ہی نہیں دیا۔ کبھی کوئی فرمائش کرنے ہی نہیں دی۔

اسد (بڑا بیٹا) ذرا اینگری مین ہے۔ میری اس تمہید پر منہ بسور کے چپ ہو رہا۔

مگر چھوٹا۔۔۔۔۔وہ تو سچ مچ کا چھوٹا ہے۔ پیچھے ہی لگ گیا اور پھر اگلے دن منی چینجر سے میرے خزانے میں اضافہ کر کے بچوں نے میرے انکار کی گنجائش ہی ختم کر دی تب ۔۔۔۔۔میں کتنی ہی دیر اپنے رب کا شکر ادا کرتی رہی۔۔۔۔اپنی اولاد کے سعادت مند ہونے پر فخر کرتی رہی اور۔۔۔۔اپنی پیاری نواسی تعبیر کے صدقے واری ہوتی رہی کہ اسی کی وجہ سے ہی تو۔۔۔۔میرا اس دیس میں آنا ممکن ہوا تھا۔

پھر میں نے بھی سوچا کہ

نہ ابنِ بطوطہ اور مارکو پولو سے میری کوئی قرابت داری ہے اور نہ ہی۔۔۔۔مستنصر حسین تارڑ اور سلمیٰ اعوان جیسی مجھ میں جی داری ہے تو پھر۔۔۔۔۔قسمت سے میسر آئے اس موقعے کو کیوں گنواؤں؟

لہذا راضی برضا ہو کر بچوں کی یہ تجویز اور پیش کش ارم اور افضال کے سامنے رکھ دی۔ افضال گھومنے پھرنے کے خاصے شوقین ہیں۔ شوقین تو ارم بھی ہے مگر۔۔۔۔۔لمبے سفر سے گھبراتی ہے کیونکہ لنکاوی۔۔۔۔اتنا قریب نہیں تھا کہ ہم کیمرون ہائی لینڈ کی طرح صبح نور کے تڑکے گھر سے نکلتے اور۔۔۔۔رات گئے تاروں کی چھاؤں میں واپس لوٹ آتے۔

یہ پروگرام تو کسی طور پر چار دن سے کم دورانیے کا نہیں بن رہا تھا۔ دو دن تو آٹھ نو گھنٹے کے سفر میں آنے جانے کے نکل رہے تھے تب افضال نے۔۔۔۔رات کے سفر کو ترجیح دیتے ہوئے دو دن بچا لئے تھے اور ہم اب اس لمبے روٹ پہ نکل پڑے تھے جس کا پہلا مرحلہ کولا کیڈہ پہنچ کے طے ہو گیا تھا۔ یہاں سے جیٹی جانے کیلئے ہمیں ایک اور بس لینا تھی اور ڈیڑھ گھنٹے کا مزید

سفر طے کرنا تھا۔ہم جب کیڈہ جیٹی پہنچے تو۔۔۔۔صبح کے سات بج رہے تھے۔میں اور ارم ویٹنگ ایریامیں چلے گئے اور افضال۔۔۔۔ٹکٹ لینے والوں کی لائن میں لگ گئے۔

قطار سسٹم اس ملک کا خاصا ہے اور لوگ اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔

ہمیں آٹھ بجے والی فیری کے ٹکٹ مل گئے تھے۔یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تھا۔اب ہمیں لنکاوی کی سیر کیلئے پورا دن مل گیا تھا۔

اس سمندری سفر سے پہلے ہم نے ایک انڈین ڈھابے سے خوب تگڑا ناشتہ کیا۔حلوہ پوری۔۔۔۔چنے اور میٹھی لسی نے مجھے پھر دہلی کے نتھوز (Nathu's) کی یاد دلا دی تھی جس کے کلونجی والے چنے اور آلو کی اچاری بھاجی ناشتے کا لطف دوبالا کر دیتی تھی۔

بورڈنگ شروع ہوگئی تو سیرانی قافلے۔۔۔۔خراماں خراماں فیری کی طرف چل دیے۔ چڑھتے سورج کی حِدت وشدت دل ہولاتی تھی مگر۔۔۔۔ایک خوبصورت جزیرے کو دیکھنے کی طلب قدموں کو تیزی سے آگے بڑھاتی تھی اور کچھ ہی دیر بعد۔۔۔۔میں خود کو سرخ اور ہلکے پیلے رنگوں سے مزین چھوٹے سے بحری جہاز نما فیری کے سامنے پاتی تھی۔جہاں جھٹ پٹ آنے والوں کو اندر کی راہ دکھا دی جاتی تھی۔

یہ ایک بڑی فیری تھی۔ہوائی جہاز کی طرح اس میں تین تین سیٹوں کی لائن دائیں بائیں آنے والوں کو اور چار سیٹوں کی لائن درمیان میں تھی۔انہی درمیانی سیٹوں کا سہارا لیتے ہوئے ہم سیٹ نمبر 248 تا 250 تلاش کرتے ہوئے فیری کے تقریباً آخری حصے تک آ گئے تھے۔جونہی بورڈنگ مکمل ہوئی۔فیری کا دروازہ بند کر دیا گیا۔مسافروں کے لیے ہدایت نامہ شروع ہو گیا اور جب لائف جیکٹس اور ہنگامی دروازے کے بارے میں اشاروں کی زبان میں سمجھایا گیا تو پل بھر کو۔۔۔۔میرا یہ نازک سا دل لرز گیا۔

اچانک ہی ٹائی ٹینک کا خیال آ گیا تھا۔نظر پہلے دور تک پھیلے نیلے پانی پہ گئی اور پھر اس

ہنگامی دروازے پہ آ ٹکی۔ تصور میں لائف جیکٹ پہنے اس ہنگامی دروازے سے باہر نکلنے کی ۔۔۔۔بھگدڑ آن بسی اور ذہن میں یہ سوچ کلبلانے لگی کہ۔۔۔۔

گہرے پانیوں پہ بھی کوئی ٹھہر پایا ہے کیا؟

خوف سے جھرجھری آ گئی۔

میں نے اس شیطانی وسوسے کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ آیت الکرسی کا ورد کر کے اس چھوٹے سے بحری جہاز کو حفاظتی حصار میں باندھا اور۔۔۔۔ پانی پہ فیری کی حکمرانی دیکھنے لگی جو۔۔۔۔مست ہاتھی کی طرح جھومتی جھامتی آگے بڑھ رہی تھی۔ پینکور آئس لینڈ والی فیری دورانِ سفر اپنے توازن میں رہی تھی مگر یہ قوی الجثہ فیری تو بے قابو ہی ہوئی جا رہی تھی۔ یہ ڈولتی تھی تو تین سو سے زائد مسافروں کو بھی ہلا کے رکھ دیتی تھی۔ ہم سب ہی دائیں بائیں ڈولنے لگتے تھے مگر۔۔۔۔ یونہی ڈولتے ڈالتے۔۔۔۔ ڈیڑھ گھنٹے میں مقررہ وقت پہ فیری ہمیں لنکاوی ٹرمینل لے آئی تھی۔

لنکاوی ٹرمینل کی خوبصورتی نے سفر کی ساری تھکن دور کر دی تھی۔

یہ ایک جدید ٹرمینل تھا۔ جسے دیکھ کے دل میں طمانیت کا احساس جاگتا تھا اور اس ملک کی خوشحالی پہ رشک آتا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی سامنے دیوار پہ لنکاوی کا بہت بڑا نقشہ آویزاں تھا جو ارد گرد کے۔۔۔۔ بہت سے جزیروں کی نشاندہی کر رہا تھا۔ اس ٹرمینل کی آرائش و زیبائش ایک جدید ائرپورٹ کی طرح دکھتی تھی۔ اس عمارت میں دائیں بائیں بہت سے دفاتر۔۔۔۔ ریسٹورنٹس اور ڈیوٹی فری شاپ کے بورڈ۔۔۔۔ انگلش میں لکھے نظر آتے تھے اور یہاں کا ٹورسٹ انفارمیشن کاؤنٹر۔۔۔۔ آنے والوں کو رہنمائی دیتا تھا۔ میں کچھ دیر اس کاؤنٹر پہ رکی اور ۔۔۔۔کچھ بروشرز اور نقشے تحفتاً وصول کیے اور پھر باہر نکل آئی۔

ہمیں ٹرمینل سے باہر آتا دیکھ کر کچھ لوگ تیزی سے ہماری طرف بڑھے بالکل ایسے ہی

۔۔۔۔جیسے ہمارے بس اڈوں اور ریلوے اسٹیشن پہ ہوتا ہے کہ۔۔۔سواری ابھی رکشا یا کار سے باہر نہیں نکل پاتی اور یہ ایجنٹ۔۔۔کھینچا تانی کر کے اسے پریشان کرنے لگتے ہیں مگر ۔۔۔یہاں صرف پیش کش کی گئی تھی، زبردستی نہیں۔

یہ لہسوڑے کی لیس کی طرح ہمارے ساتھ چپکے نہیں تھے بس ہمیں۔۔۔مائل نہ دیکھ کے دوسرے مسافروں کی طرف بڑھ گئے تھے۔

افضال نے یہاں بھی پاسپورٹ اور یونیورسٹی کارڈ جمع کرائے اور دو دن کیلئے ۔۔۔گاڑی کے مالکانہ حقوق اپنے نام کر لئے۔ ہم ہوٹل جانے کی بجائے لنکاوی کے لینڈ مارک "ایگل اسکوائر" چلے آئے جو۔۔۔ڈیوٹی فری شاپس اور جیٹی سے قریب تھا اور جہاں ۔۔۔انسانی ہاتھوں سے تراشیدہ ایک بڑا سا ریڈش براؤن عقاب۔۔۔پر پھیلائے اڑنے کو تیار دکھائی دیتا تھا۔ نیلے پانی اور نیلے آسمان کے بیچ سورج کی روشنی میں جس کی سرخ انگارہ سی آنکھیں دمکتی تھیں اور۔۔۔اس جزیرے کی سیر کو آنے والوں کو خوش آمدید کہتی تھیں اور جس کے پیروں سے تھوڑا نیچے کر کے۔۔۔جلی حروف میں لکھی ہوئے میٹل کے لنکاوی (Lankawi) پر جب سورج کی شعاعیں پڑتی تھیں تو روشنی کے منعکس ہونے سے اس عقاب کی آنکھیں خیرہ کر جاتی تھیں۔ بارہ میٹر اونچے اس عقابی مجسمے کے پیچھے۔۔۔ایک چھوٹے جزیرے Kuau کے سرسبز نظارے تاک جھانک کرتے تھے اور۔۔۔ایگل اسکوائر کے پانی اڑاتے فوارے شدید گرمی میں ٹھنڈک پہنچاتے تھے۔

کچھ دیر یہاں ہم رکے۔ ان لمحوں کو کیمرے کی آنکھ میں سمیٹا اور ہوٹل چلے آئے۔

ہمارا ہوٹل لنکاوی کے سب سے خوبصورت ساحل Pentai Cenang Beach کے قریب تھا۔ ہوٹل جاتے ہوئے میں نے دیکھا۔۔۔یہاں کی سڑکیں صاف تھیں۔

سڑک کنارے برساتی پانی کے نکاس کے لیے بنائی گئی بڑی بڑی نالیاں اور نالے

تھے جن کے اطراف سیمنٹ کی مضبوط جالیاں تھیں۔ جو پانی کہیں ٹھہرنے ہی نہ دیتی تھیں۔ جگہ جگہ ڈھانپے ہوئے کوڑادان نصب تھے۔ یہ ایک لمبی سڑک تھی۔ جس کے دونوں طرف شاندار عمارتیں نظر آتی تھیں۔ ایسی ہی ایک عمارت میں ہمارا لانگ سٹریٹ ہوٹل (Long Street Hotel) تھا۔ جس کی تیسری منزل پہ ہمارا مسکن تھا۔ جو ساحل کے قریب ہونے کی وجہ سے ہمیں مہنگا ملا تھا مگر۔۔۔ مہنگائی کا یہ زہر ہم نے خود پھانکا تھا کہ۔۔۔ دل میں نیلے پانیوں کے آخری کناروں سے ابھرتے سورج کی ہلکی نارنجی کرنوں میں لپٹی ہوئی صبح اور تاحد نظر پھیلے سمندر کی آغوش میں ڈھلتے ہوئے سورج کو دیکھنے کا شوق جو۔۔۔ اُتاولا کیے ہوئے تھا۔

کمرے کی پرسکون فضا اور ساحل کی ٹھنڈی ہوا نے ہم رتجگے کے تھکے ماندے مسافروں کو گمراہ کرنا چاہا مگر ہم اس کے چکمے میں آئے بغیر۔۔۔ تازہ دم ہو کر آئس لینڈ ہوپنگ (Island Hoping) کے ٹکٹ کاؤنٹر پر آ کھڑے ہوئے اور۔۔۔ چھ گھنٹے کا پیکج لے لیا۔ یہاں کشتیاں اور سٹیمر۔۔۔ شوقین مسافروں کو لئے پل پل سمندر میں اترتے جاتے تھے اور۔۔۔ ان کی مرضی اور شوق کے مطابق پیکج دے دیتے تھے۔ ہمارے پاس بہت وقت تھا کہ ابھی گیارہ بجے تھے۔ ویسے بھی خط استوا کے قریب اس خطے میں دن رات تقریباً برابر ہونے کی وجہ سے سورج دیر سے غروب ہوتا ہے کچھ ہی دیر میں آٹھ مسافروں سے بھری کشتی ہمیں۔۔۔ پانی کی دنیا دکھانے کے لیے پانی میں جا اتری تھی اور تقریباً پندرہ منٹ کی مسافت کے بعد ہمیں پہلے اہم پڑاؤ (Pulau Dayang Bunting) لے آئی تھی۔ یہاں ہمیں گھومنے پھرنے اور سیر کرنے کو ایک گھنٹے کا وقت دیا تھا۔

یہ ایک صاف ستھری بیچ تھی جہاں۔۔۔ سامنے تھوڑا آگے اوپر کی طرف کنکریٹ کی بنی سیڑھیاں تھیں جو ہمیں اس طرف لے جاتی تھیں جہاں۔۔۔ وہی پریگننٹ میڈن جھیل (Pregnant Maidan Lake) تھی جس کے قرب و جوار میں۔۔۔ ساری

پہاڑیاں حاملہ ہونے کا سوانگ بھرے ۔۔۔ شہزادی میمبنگ سری (Mambang Sri) اور میٹ تیج (Mat Tage) کے گوڑھے عشق کی داستان سناتی تھیں اور ان پریمیوں کے ۔۔۔ نوزائیدہ مردہ بچے کو جھیل بُرد کرنے پہ اب تک آنسو بہاتی تھیں۔ یہ پہاڑیاں ۔۔۔ شہزادی کے پھر کبھی ماں نہ بن پانے کا دکھ خود پہ جھیل رہی تھیں اور اس کا یہ دکھ بانٹنے کو ۔۔۔ ماں بننے والی عورت کا روپ دھارے ہوئے تھیں۔ قدم سے قدم ملا کر چلنے والا گائیڈ جو بھلے من گھڑت کہانی ہی سنا رہا تھا وہ میرا یقین ۔۔۔ اس واقعے پر تو نہیں البتہ ۔۔۔ عشق کی سچائیوں پر ضرور پختہ کر گیا تھا۔ جھیل تک جانے میں پندرہ منٹ کی چڑھائی نے مجھے تھکا دیا تھا مگر ۔۔۔ کثافتوں سے پاک ہوا اور فضا نے سنبھالا دیا ہوا تھا۔

سمندر کی چھاتی سے لپٹی اس جھیل کو ۔۔۔ لائم سٹون کی ان پہاڑیوں نے جُدائی کا رنگ دے رکھا تھا۔ سیفٹی جیکٹس پہنے یہاں بہت سے لوگ سوئمنگ کر رہے تھے۔ بدیشی عورتیں مختصر کاسٹیوم میں جب ڈُبکیاں لگاتی تھیں تو ۔۔۔ ساحل پہ کھڑے ہمارے مشرقی ممالک کے مردوں کو نہال سا کر جاتی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک ماڈرن بیچ تھا جس کے نظارے لوگوں کو اپنی گرفت سحر میں لئے ہوئے تھے۔

ہمارا دوسرا پڑاؤ لنکاوی سے سترہ کلومیٹر آبی فاصلے پر (Pulau Singa Besar) تھا۔ جس کا ایک نام (Giant Lion Island) تھا مگر مجھے تو یہاں کوئی دیو قامت شیر دکھائی نہیں دیا تھا۔ البتہ دوسرے کئی جانور اور پرندے ۔۔۔ بہت سے مسافروں کے سامنے بڑی بے تکلفی سے گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ خاص طور پر سنہری عقاب جب اپنے پر پھیلاتا تھا تو گویا سونا بکھیر دیتا تھا۔ یہیں وہ (Mangorove) کے درخت ۔۔۔ قطار در قطار سمندر کی سرکش لہروں کے باوجود پانی میں قدم جمائے کھڑے تھے اور دیکھنے والوں حیران کر رہے تھے۔ پانی کی سرکش لہروں میں جانے کیسے یہ درخت اپنا آپ سنبھالے ہوئے تھے۔

یہیں ۔۔۔قریب ہی ایک غار بھی تھی جسے ۔۔۔دیکھنے کے شائق ٹارچ لئے بھاگے جاتے تھے۔افضال نے مُجھے بھی غار تک جانے کو کہا مگر۔۔۔میں انکاری ہوگئی تھی۔ان پریگننٹ پہاڑیوں والی جھیل کی اترائی چڑھائی نے مجھے بہت تھکا دیا تھا۔ہماری کشتی پھر خاموش پانیوں میں رواں تھی۔ایک چھوٹا سا جزیرہ بھی قریب نظر آنے لگا تھا۔

اب کے جو کشتی چلی تو کچھ ہی منٹ کے بعد۔۔۔روک دی گئی تھی۔یہ ایگل فیڈنگ پوائنٹ تھا۔جہاں باز اور عقابوں کے غول ہمارے سروں پہ منڈلا رہے تھے۔ساحل پہ گوشت لئے یہاں بھی لوگ اسی طرح کھڑے تھے جیسے۔۔۔ہمارے لاہور کی اکثر شاہراہوں پہ چیل گوشت بیچنے والے کھڑے ہوتے ہیں۔یہاں گوشت اچھالنے اور اسے جھپٹنے کا کھیل جاری تھا۔جونہی لوگ گوشت فضا میں اچھالتے،باز اور عقاب تیزی سے لپکتے اور۔۔۔سمندر میں گرنے سے پہلے ہی اپنا شکار دبوچ لیتے۔اس چھینا جھپٹی میں ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی تو دیتی تھی مگر۔۔۔سمندر کی پرشور لہروں اور ہوا کے فراٹوں میں کہیں گم ہو جاتی تھی۔

اس سے اگلا مختصر قیام مونکی پوائنٹ پہ کیا گیا تھا جہاں۔۔۔بندروں کی پوری کھیپ درختوں کے جھنڈ کے قریب۔۔۔لوٹ مار میں مصروف تھی۔ایگل پوائنٹ کی طرح لوگ بسکٹ ۔۔۔چپس اور ڈبل روٹی کے پیکٹ بندروں کی طرف پھینکتے تھے۔نشانہ صحیح بیٹھتا تو بندر ۔۔۔جھپٹا مار کے ریپر اتار پھینکتے تھے اور اشیائے خوردنی کھانے لگتے تھے اور اگر۔۔۔نشانہ چوک جاتا۔۔۔پیکٹ پانی میں جا گرتے تو بندر۔۔۔ہونقوں کی طرح ادھر اُدھر دیکھنے لگتے تھے۔تیسرا اور آخری پڑاؤ (Pulau Beres Basah) تھا۔جس کے ساحل پہ سفید ریت چینی کے دانوں کی طرح بکھری ہوئی تھی۔اسی مناسبت سے اسے وائٹ رائس آئس لینڈ بھی کہا گیا ہے۔پانی سے ذرا دور۔۔۔کنارے کنارے سبزے نے جال بچھا رکھا تھا۔چمکتی ریت اور مچلتا پانی۔۔۔میرے تصور سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت دکھتے تھے۔یہاں لکڑی

کے بڑے بڑے تختے۔۔۔۔سمندر میں بچھے فلوٹنگ کرتے تھے اور ان تختوں پہ چلتے ہوئے لوگ۔۔۔۔قریبی جزیرے تک چلے جاتے تھے گویا یہاں پانی گہرا نہیں تھا۔کہتے ہیں یہاں کے بہت سے جزیروں پہ رات کو پانی اتر جاتا ہے اور خشکی راستہ بنا دیتی ہے تو مقامی لوگ پیدل ۔۔۔۔ایک سے دوسرے جزیرے تک چلے جاتے ہیں۔سورج نکلتے ہی سمندر کا پانی بے قابو ہو کر مچلتا ہے اور یہ رستے بند کر دیتا ہے جب کہ سورج ڈوب جانے پہ۔۔۔۔ان جزیروں سے پانی اتر کر پھر جگہ بنا دیتا ہے۔

ٹھنڈے پانیوں والے اس ساحل کنارے۔۔۔۔گرم گرم بنانا(Banana) پکوڑے لطف دے گئے تھے اور ہمیں پکوڑوں میں مصروف دیکھ کر۔۔۔۔ایک شرارتی سا بندر تعبیر کا فیڈر اٹھا کے بھاگ گیا تھا اور ہمارے سامنے منڈیر پر بیٹھ کے فیڈر پینے لگا تھا۔

کشتی ٹور سے واپسی پر پہلے فیڈر خریدا گیا اور ہم۔۔۔۔ Pentai Chnang Beach پہ آ گئے کہ یہاں ہمیں۔۔۔۔سورج کو پانی میں اترتے دیکھنا تھا۔ہم یہاں آئے تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر۔۔۔۔سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔سامنے گہرے سبز درختوں نے اپنا آنچل پھیلا رکھا تھا۔پہاڑوں پہ شام ہجر کے انوکھے رنگ لئے اتر رہی تھی۔نیم تاریکی اور ۔۔۔۔نیم روشنی کا یہ حسین امتزاج بہت بھلا لگ رہا تھا۔ادھر روشنی کی آخری لو پہاڑوں کے پار اتری۔ادھر سمندر نے۔۔۔۔کسی ماتم کناں کی طرح اندھیرے کی چادر اوڑھ لی تھی۔خاموشی اپنے پورے حسن کے ساتھ ساحل پہ براجمان تھی۔میں کتنی دیر اس خاموشی کو سنتی رہی۔اس حسن کو اپنی آنکھوں میں سمیٹتی رہی۔رات کا رنگ گہرا ہوا تو ہم نے واپسی کے لیے اپنے قدم موڑ لئے۔پورا دن اور پوری رات سفر میں گزر گئی تھی۔اب تھکن اور بھوک دونوں نے طوفان مچا رکھا تھا۔اس لئے تیلا گا عربیک (Telaga Arabic) کے لذیذ سی فوڈ سے پیٹ پوجا کر کے ہم لانگ اسٹریٹ ہوٹل کی طرف چل دیے تھے کہ اب۔۔۔۔مزید کچھ دیکھنے کی۔۔۔۔اور کہیں رُکنے کی ہمت ہی نہ تھی۔

سکائی گلائیڈ سے سکائی برج تک

اس خطۂ بے نظیر میں صبح اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نمودار ہوئی تھی۔ میں بالکونی میں آئی تو لگا۔۔۔۔ جیسے جاڑوں کی آغوش میں دُبکی ہوئی یخ بستہ ہوا نے انگڑائی لی ہو۔ پہاڑوں کی برفیلی نشیلی ہوائیں رقص کناں ہوئیں تو۔۔۔۔ جولائی کے مہینے میں بھی ہڈیوں میں گودا جمتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

تو گویا رات برکھا خوب برسی اور ہم۔۔۔۔ بند کمرے میں گہری نیند سوئے ہوئے مکینوں کو خبر ہی نہ ہوئی۔ میں نے دل میں کہا اور اس خوبصورت جزیرے پہ بوندوں کا جلترنگ ۔۔۔۔ نہ سننے کا ملال لئے روف ٹاپ پہ چلی آئی کہ ناشتہ (جو ہمارے لانگ سٹریٹ ہوٹل کے پیکج میں تھا)۔۔۔۔ چھت پر سرو کیا جا رہا تھا۔ میں کچھ دیر ادھر ادھر اس پرسکون چھوٹے سے شہر کو دیکھتی رہی۔ میرے دائیں طرف وہ خاکستری پہاڑ نظر آ رہا تھا جس کے دامن سے نکلتی۔۔۔۔ شیطان کی آنت کی سی ایک لمبی سڑک تھی جو ناک کی سیدھ میں چلتی میلوں دور تک چلی گئی تھی۔ ہمارا ہوٹل اسی لانگ سٹریٹ پہ تھا۔ ہمارے بائیں طرف سمندری نظارے تھے۔

جنگل، پہاڑ، سمندر، ہوا، دھوپ اور ہلکی ہلکی رِکن مِن نے قدرت کے سارے رنگ میرے سامنے پھیلا دیے تھے۔

انہی رنگوں میں خود کو بھگوتے ہوئے میں نے سوچا!

اگر میں یہاں نہ آتی تو سچ مچ ۔۔۔۔ملائیشیا کی یہ سیر ادھوری رہ جاتی۔

ناشتہ کرتے ہی ہم (Pantai Cenang Beach) پہ آ گئے جہاں ۔۔۔۔سورج کی نوزائیدہ کرنیں سمندر سے ہم آغوش ہو رہی تھیں۔ساحل پہ رونقیں آباد تھیں۔بوٹنگ اور جیٹ سکائنگ (Jet Skying) کے ۔۔۔۔مزے لوٹے جا رہے تھے۔ کچھ جیالے پیرا سیلنگ (Paraceiling)۔۔۔۔کر رہے تھے۔کچھ من چلے۔۔۔۔آنکھیں موندے دھوپ کی تمازت سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور کچھ میرے جیسے بھی تھے جو۔۔۔۔صرف دیکھ رہے تھے۔۔۔۔سمندر کی خامشی کو محسوس کر رہے تھے۔افضال نے پیرا سیلنگ کے لئے بہت اکسایا مگر۔۔۔۔میں اتنی دلیر کب تھی؟

کہ سمندر کے بیچوں بیچ اکیلی اڑتی پھرتی؟

البتہ یہ ضرور جی چاہا! یہاں رُکے رہیں۔ کچھ دیر اور یہاں رکیں سیلی سیلی ہوا اور ٹھنڈے ٹھار پانی کے مزے لیں۔۔۔۔چلبلاتی ہوئی موجوں سے چھیڑ چھاڑ کریں مگر۔۔۔۔

ہمیں تو اب ان بلندیوں کی طرف جانا تھا جہاں۔۔۔۔دو پہاڑوں سے ٹیک لگائے، خلا میں لہراتا ہوا، بل کھاتا ہوا سکائی برج کھڑا تھا۔میں نے واپس مڑتے ہوئے ایک الوداعی نظر Pantai Cenang Beach پہ ڈالی جہاں دور تک شفق کی لالی نیلے پانیوں میں گھلی ہوئی تھی۔

میں نے سوچا! سچ کہا تھا اسد نے!

کون آتا ہے بار بار یہاں!

کون آ سکتا ہے بار بار یہاں؟

اور پھر اپنے قدم (Gunung Mat Cincang) کی طرف بڑھا دیے جو ۔۔۔۔لنکاوی کا دوسرا بلند پہاڑ کہلاتا ہے۔اورینٹ ولیج (Orient Village) اسی بلند پہاڑ

سے لپٹا ہوا ایک دیدہ زیب کمپلیکس تھا جہاں۔۔۔۔دنیا بھر کی ثقافتی اور کاروباری سرگرمیوں کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔یہیں سے سکائی کیب (Sky Cab) کے ٹکٹ مل رہے تھے۔ہم یہاں سے سکائی کیب میں بیٹھے اب اس دنیاوی پل صراط کی طرف جا رہے تھے جسے۔۔۔۔سکائی برج (Sky Bridge) کہتے ہیں۔

گینتھنگ ہائی لینڈ میں تو اونچائی کا یہ سفر مجھے خوفزدہ کر گیا تھا مگر اب کے میں نے۔۔۔۔ان بلندیوں سے نیچے جھانکنے کی کوشش ہی نہیں کی۔جی کو سنبھالے بس دائیں بائیں کے شاندار نظارے دیکھتی رہی۔دوسری سکائی کیب کی آنیاں جانیاں دیکھتی رہی اور سکائی کیب کے آہنی دروازے کے بند ہونے کے باوجود اندر آتی ٹھنڈی ہوا کو محسوس کرتی رہی۔کچھ ہی دیر میں یہ سکائی کیب جادوئی منظر دکھاتی ہوئی۔۔۔۔برساتی جنگلوں کے اوپر سے گزارتی ہوئی۔۔۔۔درختوں کے مرغولوں میں رستہ بناتی ہوئی ہمیں۔۔۔۔مڈل اسٹیشن پہ لے آئی تھی۔

اس مڈل سٹیشن پہ ہمیں رکنا تھا اور۔۔۔۔سکائی گلائیڈ میں بیٹھنا تھا مگر ابھی ہم۔۔۔۔ڈھنگ سے اترنے بھی نہ پائے تھے کہ کیمرے لٹکائے کئی لوگ ہمارے استقبال کو بڑھنے لگے تھے اور وہ پروفیشنل فوٹو گرافر ہماری طرف متوجہ ہونے لگے۔اپنی اس پذیرائی پہ ہمیں لمحہ بھر کو حیرت تو ہوئی لیکن افضال۔۔۔۔ان کے جھانسے میں آئے بغیر ہمیں لے کے آگے بڑھ گئے تھے۔

بلندیوں کی یہ پہلی منزل تھی جہاں سے۔۔۔۔بے مثل قدرتی مناظر ہمارے سامنے تھے۔دوربین نے یہ مناظر کچھ قریب کر دیے تھے۔یہاں سے بہت سے لوگ اپنی مرضی سے راہیں جدا کر رہے تھے۔سکائی گلائیڈ سے جانے کی بجائے کچھ لوگ بچت کرتے ہوئے پیدل جانے کو ترجیح دے رہے تھے پر میں۔۔۔۔ان بچتو لوگوں میں سے ہرگز نہیں تھی۔اور پھر میں توکل۔۔۔۔محبتوں بھری ان پریگنٹ پہاڑیوں تک جانے والی جھیل کی۔۔۔۔ان گنت

سیڑھیاں اتر چڑھ کے ہمت ہار بیٹھی تھی۔ لہذا سکائی گلائیڈ (Sky glide) کی سواری کی گئی جو پٹڑی پہ گھسیٹتی۔۔۔۔ رینگتی۔۔۔۔ دھیرے دھیرے ہمیں سطح سمندر سے کئی سو میٹر اونچے پہاڑ پہ بنے اس سکائی برج پہ لے آئی تھی جو۔۔۔ اپنے ہمسایہ پہاڑ کا سہارا لئے ہوا میں معلق کھڑا تھا اور جسے۔۔۔۔ مضبوط دھات کے ایک اونچے مینار نے گہری گھاٹیوں سے سر نکال کے سنبھالا ہوا تھا۔

میں اتنی اونچائی پہ اس پل کو نصب کرنے والے انسانی ذہنوں کو سراہتی تھی اور ۔۔۔۔ اسے بنانے والے ہاتھوں کی ہنر مندی کے گُن گاتی تھی۔ افضال دور بین میری آنکھوں سے لگائے مجھے اینڈمان سی (Andman Sea) دکھاتے تھے اور کبھی دور۔۔۔۔ تھائی لینڈ کے جزیروں تک لے جاتے تھے جب کہ میں واضح۔۔۔۔ یہ سب نہ دیکھ پانے پر بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتی تھی اور سکائی برج کے دو طرفہ بنی سٹیل کی مضبوط ریلنگ کو تھامے جاتی تھی۔ بہت سے اور لوگ بھی میری طرح اس ریلنگ پہ بُنے سٹیل کی تاروں کے مہین جال میں اپنی انگلیاں پھنسائے۔۔۔۔ ان بل کھاتے راستوں کو دیکھتے اور اپنا دل ہولاتے تھے۔ جن سے ابھی کچھ دیر پہلے۔۔۔۔ وہ گزر آئے تھے مگر پہاڑی منظر جب۔۔۔۔ اپنی دلکشی دکھاتے تھے تو پھر وہ ہاتھ بڑھا کے آسمان چھونے کی کوشش کرتے تھے جو قریب۔۔۔۔ بالکل قریب محسوس ہوتا تھا۔ یہاں ایک طرف پوسٹ آفس کاؤنٹر پہ کچھ لوگ۔۔۔۔ اپنے پیاروں کو پوسٹ کارڈ بھیجتے نظر آتے تھے اور کچھ ان بلندیوں پر بھی خریداری میں مصروف دکھائی دیتے تھے اور میں۔۔۔۔۔

اس لہراتے۔۔۔۔ بل کھاتے دنیا کے سب سے بڑے پل پہ کھڑی یہ سوچتی تھی کہ دنیا بھر سے کتنے ہی لوگ۔۔۔۔ اس جگہ اونچائیاں، اترائیاں اور گہرائیاں دیکھنے یہاں آتے ہیں اور سیاحت سے اس ملک کی معیشت کو مضبوط تر کر جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ تو ہمارے پاس بھی ہے۔ پہاڑ، سمندر، آبشاریں، جھرنے کس چیز کی کمی ہے میرے دیس میں؟

بس ایک جذبہ حب الوطنی ہو تو بات بن جائے ہمارے کسی لیڈر نے ملک کو مثالی بنانے کی کوشش نہیں کی بس۔۔۔۔اسے لوٹنے کھانے میں ہی لگے رہے۔

میں بوجھل دل لئے اس پُل سے اُتر آئی۔ حالانکہ اس کی بناوٹ اور سجاوٹ نے روح تک کو نہال کر دیا تھا۔

ریاست کیڈہ کے تاج میں۔۔۔۔جگمگاتے ہیرے لنکاوی میں۔۔۔۔کسٹم ڈیوٹی اور ٹیکس نہ ہونے کی وجہ سے چیزیں بہت سستی تھیں۔ تبھی ارم اور افضال بھی لانگ سٹریٹ کے اس بازار میں جا گھسے تھے۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ یہاں چیزیں مہنگی نہیں تھیں۔۔۔۔کھانا بھی مہنگا نہیں تھا بس۔۔۔۔رہائش مہنگی تھی کہ لوگ دور دور سے لنکاوی کا حسن دیکھنے آتے تھے۔

لنکاوی وہ حسین جزیرہ ہے جس کے آس پاس۔۔۔۔بہت سے چھوٹے بڑے جزیرے پھیلے ہوئے ہیں۔ جہاں سمندر کا پانی۔۔۔۔رات کو سمٹ کر بہت سے جزیروں کو آپس میں ملا دیتا ہے اور پیدل آنے جانے کے لئے رستہ۔۔۔۔بنا دیتا ہے۔ جس کے ساحل صاف ستھرے ہیں اور وائٹ سینڈ، ریڈ سینڈ اور بلیک سینڈ کا ذخیرہ ہیں۔ جس کے جنگلوں اور درختوں کا رنگ سمندر میں اتر کے اسے کبھی زہر مورا اور کبھی ہرا کچور کر دیتا ہے۔ جہاں پانی پہ قدم جمائے درختوں کی لمبی قطاریں ہیں۔ جہاں ممتا کا روپ دھارے بہت سی پہاڑیاں محبت کرنے والوں کی یاد میں آنسو بہاتی ہیں اور جہاں کے سنہری عقاب۔۔۔۔جب اپنے پر پھیلاتے ہیں تو سمندر کو سونے رنگا کر جاتے ہیں۔ اس لنکاوی میں دیکھنے کو اور بھی بہت کچھ ہے۔ ہم نے بھی بھاگم دوڑ کر کے۔۔۔۔ان دو دنوں میں لنکاوی کے بہت سے حسین رنگ دیکھ لئے تھے اور اب مزید قدرتی نظارے دیکھنے کو۔۔۔۔پینانگ (Penang) جانے کا پروگرام بنا لیا تھا کہ طے شدہ دنوں میں سے پورا ایک دن ابھی ہمارے پاس تھا۔ اس لئے پہلے فیری کی بکنگ کرائی پھر۔۔۔۔ہوٹل جا کر سامان اٹھایا۔ ان ٹھنڈی ہواؤں کو خدا حافظ کیا اور لنکاوی جیٹی پہ گاڑی واپس کر کے ٹرمینل میں

بنائے گئے   کے۔ ایف۔ سی میں جا بیٹھے کہ۔۔۔۔ کھانا ضروری ہو گیا تھا اور فیری کے سفر کے دوران فیری انتظامیہ سے کسی قسم کی انٹرٹینمنٹ کی توقع کرنا حماقت تھی۔

لنکاوی سے پینانگ پہنچنے میں ہمیں تین گھنٹے لگے تھے۔ دورانِ سفر سمندر کے نیلگوں پانی کی وسعتوں میں سیاہ رنگ کے پانی کی آمیزش۔۔۔۔ مجھے حیرتوں میں غوطہ زن کر گئی تھی۔ میں نے جب یہ سنا تھا تو یقین نہیں کیا تھا مگر اب میرے سامنے یہ دو رنگا پانی تھا۔ نیلے پانیوں کے بیچ یہ اٹھکیلیاں کرتا سیاہ رنگ پانی اپنی اوقات میں رہ کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور۔۔۔۔ پانیوں کے بھائی چارے کی مثال قائم کرتا تھا۔

پینانگ جیٹی پہنچے تو دھوپ واپسی کا سفر طے کر رہی تھی مگر سورج ابھی سمندر کی آغوش سے ہمکنار نہیں ہوا تھا (Bay view Beach Resort) پہ ہماری بکنگ ہو چکی تھی۔ پہلے ہمیں ہوٹل جانا تھا۔ ہمارا یہ ہوٹل Batu Ferringhi Beach کے قریب تھا۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا جب ہم یہاں چلے آئے تھے۔ سمندر کی آغوش میں سورج دھیرے دھیرے دبکنے لگا تھا اور دور قطار در قطار کھڑے چھوٹے نازک سے پام یہ سب دیکھتے تھے اور شرما کے لہراتے تھے۔ سفید چینی سی ریت ہوا کے دوش پہ رقص کرتی جاتی تھی۔ دیدہ زیب پینٹنگ والی فشنگ بوٹس۔۔۔۔ آبنائے ملاکا کے پانیوں سے کھیلتی تھیں اور۔۔۔۔ گئے دنوں کے قصے دہراتی تھیں۔ جب یہاں برٹش کالونی ہوا کرتی تھی۔

سورج کے جاتے ہی چاند نے اپنے روشن اُجالے بکھیرے تو میں نے مدتوں بعد۔۔۔۔ اس میں چرخہ کاتتی ہوئی اس بڑھیا کو دیکھا جو کبھی مجھے۔۔۔۔ اپنے گاؤں والے گھر کے بڑے سے کچے صحن سے صاف نظر آیا کرتی تھی۔

اب تو شہروں کی ماحولیاتی آلودگی نے ہمارے اور چاند کے درمیانی فاصلے کو دھندلا دیا تھا۔

جی چاہا! اس خوب چمکتے چاند اور اس میں بیٹھی بڑھیا کو کچھ دیر دیکھوں ۔۔۔۔ یہاں کچھ دیر اور رکوں مگر ۔۔۔۔ ابھی تو ہمیں اس شہر کو دیکھنا تھا جہاں ۔۔۔۔ گام گام تاریخ کے نقوش ثبت تھے۔ سو ہمیں جانا تھا اور پھر دوبارہ یہاں نہیں آنا تھا۔ میں نے اس ساحل کے حسین نظاروں کو پہلی بار اور پھر آخری بار نظر بھر کے دیکھا اور پینانگ آئس لینڈ کے صدر مقام کی طرف چل دیے۔

پینانگ آبنائے ملاکا کی ساحلی پٹی پر ۔۔۔۔ جنوب مغرب کی طرف دو حصوں میں بٹی ہوئی ریاست ہے۔ جس کا ایک حصہ سبرنگ پرائے (Sebrang Perai) اور دوسرا پینانگ آئس لینڈ (Penang Island) کہلاتا ہے۔ یہ ملائیشیا کے ساحلی علاقوں کے ان چار مراکز میں سے ہے جہاں ۔۔۔۔ اٹھارویں صدی سے بیسویں صدی تک انگریز حکمران رہے۔ ساؤتھ ایسٹ انڈیا میں برطانیہ کی یہ پہلی سیٹلمنٹ تھی جہاں ۔۔۔۔ ریاست تو ملّے قوم کی ملکیت تھی مگر قانون ۔۔۔۔ برطانیہ کے لاگو کئے گئے تھے۔ یہ شہر 1867ء میں برٹش کراؤن کالونی بنا اور ملائیشیا کے آزاد ہونے تک ۔۔۔۔ ملکہ الزبتھ دوم کا شہر جانا گیا۔

جارج ٹاؤن (George Town) سمندر کنارے آباد ایک دیومالائی شہر ہے۔ جس کے ایک طرف سمندر ہے اور دوسری طرف پہاڑ ہیں۔ اس شہر کو دلفریب ساحلوں ۔۔۔۔ کثرت سے بارشیں برساتے جنگلوں ۔۔۔۔ شاندار عمارتوں ۔۔۔۔ دیدہ زیب مسجدوں اور رنگ برنگ مندروں میں رچا بسا دیکھ کے یونیسکو نے جارج ٹاؤن کو ورلڈ ثقافتی ورثہ قرار دے دیا ہے۔ ہم جارج ٹاؤن کی جاگتی سڑکوں سے ہوئے دوبارہ پینانگ جیٹی آ گئے تھے کہ یہاں ہمیں کلان جیٹیز (Clan Jetties) دیکھنا تھیں۔ یہ کلان جیٹیز پینانگ کا تاریخی اثاثہ ہیں۔ جسے ۔۔۔۔ چینیوں نے خوب بنا سنوار رکھا تھا۔ انیسویں صدی میں جب کچھ چینی ہجرت کر کے پینانگ آئے تھے تو ۔۔۔۔ انگریزوں کا راج پاٹ ہونے کی وجہ سے انہیں اس شہر میں کہیں جگہ نہ مل سکی تھی۔ تب

یہ چینی۔۔۔جو بحری جہازوں سے مال اتارنے اور چڑھانے کا کام کرتے تھے یہیں سمندر کنارے۔۔۔ڈیرے ڈال کے بیٹھ رہے تھے۔انہوں نے مضبوط لکڑی کے گز گز بھر لمبے تختے اور جوڑے سمندر میں بچھا دیے اور یہیں۔۔۔لکڑی کے چھوٹے چھوٹے گھر بنا کر پانی میں رہنے لگے۔ہمارے تپڑواسیوں اور جھگی نشینوں کی طرح۔۔۔یہ بنا سہولتوں والے ان گھروں میں زندگی جینے کو دور سڑک سے پینے کا پانی لاتے تھے کبھی سامان لوڈ کرتے کبھی کشتیوں کی مرمت کرتے اور اپنی روزی کماتے تھے۔پانی پہ تیرتے ان گھروں میں وُہ سمندر کی سرکشی بھی سہتے تھے۔ملائیشیا آزاد ہوا تو حکومت کی طرف سے انہیں بھی کچھ سہولتیں اور سائبان میسر آئے۔تب سے اب تک یہ چھ جیٹیز کا قبیلہ الگ الگ بستیاں بسائے ہوئے یہاں آباد تھا۔گاڑی ہم نے سمندر کنارے کھڑی کر دی تھی۔جہاں۔۔۔کشتیوں میں سٹال سجنے لگے تھے ہم ایک کلر فل تراشوا میں سوار ہو کر۔۔۔یہاں کی سب سے قدیمی جیٹی (LIM) کے داخلی دروازے تک چلے آئے تھے۔اس جیٹی کو ہمارے لئے ترشوا کے پائلٹ لی (LEE) نے منتخب کیا تھا۔وہ ہمیں اپنے ترشوا جہاز سے فراٹے بھرتا ہوا ہمیں یہاں لے آیا تھا۔یہ جیٹی پانی پہ فلوٹنگ کرتا ایک گاؤں تھا۔جس کی سجاوٹ قدیم چینی ثقافت میں کی گئی تھی۔یہاں ہر گھر کے دروازے پہ موم بتیاں جگمگاتی تھیں اور ہر گھر کے اندر اپنی اپنی عبادت گاہیں نظر آتی تھیں۔داخلی دروازے پہ (LIM JETTY) کے جلی حروف چمکتے تھے اور وہاں سے۔۔۔گھروں تک آتا ہوا رستہ خوب سجا سنورا دکھتا تھا۔ہم پانی پہ چلتے ہوئے اس فلوٹنگ گاؤں تک آ گئے تھے۔ہم تو بہت سنبھل سنبھل کے۔۔۔لکڑی کے ہلتے ہوئے تختوں پہ قدم جماتے ہوئے یہاں آئے تھے۔جب کہ جیٹی کے مکین۔۔۔بلا خوف وخطر ان رستوں پہ آ جا رہے تھے۔یہ چینی ہم اجنبیوں کی آمد سے بے نیاز اپنے کاموں میں مگن تھے۔جب کہ گول گول آنکھیں مٹکاتے ہوئے ان کے چھوٹے چھوٹے بچے ہمیں دیکھ کے مسکراتے تھے۔۔۔شرماتے تھے۔

ارم ان بچوں کے ساتھ تصویریں بنوا رہی تھی اور لم جیٹی پہ کھڑی میں یہ سوچ رہی تھی کہ انسان زندگی جینے کو کیسی کیسی کٹھنائیاں برداشت کرتا ہے۔ وہ کسی مذہب کا ہو۔۔۔ کسی ملک یا قبیلے سے تعلق رکھتا ہو گھر۔۔۔ اس کی ضرورت ہوتا ہے اور اپنی اس ضرورت کے لئے۔۔۔ وہ پانی پہ بھی گھر بنا لیتا ہے۔

جیٹی سے نکلے تو کوئین وکٹوریہ میموریل کلاک کی تمکنت سامنے نظر گئی۔ سفید رنگ کا یہ ساٹھ فٹ اونچا کلاک ٹاور پینانگ کے ایک ارب پتی چینی نے 1897ء میں ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی پہ۔۔۔ یادگار کے طور پر تعمیر کرایا تھا۔ ہم شی شین اوک (Cheah Chen Eok) کے ملکہ کو۔۔۔ تحفتاً پیش کئے گئے اس نذرانے کی شاہانہ فضا سے نکلے تو۔۔۔ تاریخی گلیوں میں گھومتے ہوتے گرنی ڈرائیو نائٹ لائف (Gurney Drive Night Life) آگئے۔ یہ ہماری فوڈ سٹریٹ کی طرح تھی۔ یہاں چائینیز، ملّے اور انڈین کھانوں کے سٹال تھے۔ ایک جگہ رحیم برگر کا بورڈ میرا جی خوش کر گیا۔

گمان یہی گزرا یقیناً۔۔۔ یہ کسی پاکستانی کا ہو گا مگر۔۔۔

پوچھ گچھ تک میری رسائی ہی نہ ہو پائی کیونکہ رحیم برگر تو اس وقت مچھلی منڈی بنا ہوا تھا۔ مجھے اپنا۔۔۔ اے۔۔ جی۔ ایچ۔ ایس کی ملازمت کا دور یاد آ گیا جب میں اور شاہ تاج قزلباش۔۔۔ اپنے ایک ساتھی ورکر ندیم خان کو لاثانی برگر لینے گلبرگ (لبرٹی) بھیج دیتے تھے اور پھر۔۔۔ اس کے دیر سے آنے پہ جُز بز بھی ہوتے تھے تو وہ۔۔۔ تلملا کے کہتا تھا۔

تسنیم بی بی اوتھے ایناں رش سی۔ تسی آپ جا کے ویکھو کدی تے فیر پتہ لگے۔

جارج ٹاؤن کی گلیاں گریفٹی آرٹ کے شاندار نمونہ تھیں بالکل ملا کا شہر کی طرح۔۔۔

ہم رات گئے تک اس شہر کی سڑکوں پہ گھومتے پھرتے ہوئے۔۔۔ تاریخ کی چاپ

سنتے رہے تھے اور پھر۔۔۔Bay view ہوٹل آ کے لمبی تان کے سو گئے تھے تا کہ خوب تازہ دم ہو کر پینانگ ہل اسٹیشن کی سیر کو نکلیں اور سفر کو یادگار بنائیں۔

جارج ٹاؤن سے چند کلومیٹر کے فاصلے پہ یہ ہل اسٹیشن پینانگ کا سب سے بلند مقام ہے جو۔۔۔ 1923ء میں ایک بڑے پہاڑ پر بنایا گیا تھا اور جس کے ٹاپ تک جانے کیلئے ۔۔۔پہاڑ کو تراش کر نیچے سے لے کر بہت بلندی تک پتلی سی ریلوے لائن بچھا کر۔۔۔ایک منی سی ٹرین چلا دی گئی تھی جو۔۔۔ پہاڑوں کا سینہ چیرتی۔۔۔ کسی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی۔۔۔ پہاڑوں میں منہ چھپاتی۔۔۔سیٹیاں بجاتی ہمیں پینانگ ہل اسٹیشن کی طرف لئے جا رہی تھی۔

مجھے شملہ یاد آ گیا۔ جب کالکا سے شملہ تک ہم اس طرح کی منی ٹرین سے گئے تھے۔

ہمیں یہاں سے پورا جارج ٹاؤن اور دیگر علاقے دکھائی دے رہے تھے۔

ہم نے اس شہر میں تاریخ کے بہت سے رنگ دیکھے خوبصورت آرائش و زیبائش والا بدھسٹ ٹیمپل کک لوک سی ٹیمپل (Kek Lok Si Temple) دیکھا۔۔۔1835ء میں تعمیر ہونے والا چائینیز ٹیمپل اور میوزیم (Khou Khonsi) کو اچٹتی ہوئی نگاہ سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ موروش آرٹ کا بہترین نمونہ اور۔۔۔ پینانگ کا لینڈ مارک 1801ء میں پینانگ میں بننے والی پہلی مسجد کپیلنگ کیلنگ (Kapilan Keling) کو بھی صرف باہر سے ہی دیکھ سکے کہ یہاں حکام سے اندر جانے کی پہلے اجازت لینا ضروری تھی جو ہم نہیں لے سکے تھے۔ انڈین مسلم تاجروں کی اس شاہکار مسجد کو دیکھ کے ہم قلعہ کارن والیس (Fort Cornwallis) تک آ پہنچے برٹش دور کے اس قلعے کو فرینک لائٹ (Franics Light) نے 1810ء میں تعمیر کرایا تھا۔

جارج ٹاؤن کی تعمیر و ترقی میں فرینکس لائٹ نے خصوصی دلچسپی لی اور اسے

۔۔۔۔برطانوی شہر کا روپ دے کر شاہ جارج سوم کے نام کی تختی سے سجا دیا۔ فرینکس لائٹ ایک مہم جو برطانوی تھا۔ جو 1740ء میں پیدا ہوا 1759ء سے 1763ء تک وُہ برطانوی بحری فوج میں افسر رہا۔ 1771ء میں بحری چوکی قائم کرنے کا منصوبہ لے کے وہ ریاست کیڈہ آیا اور اس وقت کے سلطان محمد سے تعلقات بڑھا کے ایک معاہدے کے تحت۔۔۔۔ یہ علاقہ حاصل کر کے اسے ایک مثالی۔۔۔۔ تاریخی، برطانوی نو آبادیاتی شہر بنا دیا۔ اپنے کام کی لگن میں اس نے ۔۔۔۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور یہیں اسی شہر میں اس نے زندگی کی آخری سانسیں پوری کیں۔

پھر جارج ٹاؤن نے بھی اپنے اس محسن کو نہیں بھلایا تھا۔ سینٹ جارج چرچ کے احاطے میں نصب فرینکس لائٹ کا قد آدم مجسمہ اس بات کا گواہ تھا۔

انگریز سامراج جہاں بھی قابض ہوئے انہوں نے ۔۔۔۔ وہاں بہترین مقامات دریافت کئے ۔۔۔۔ ان میں عمدہ تبدیلیاں کیں اور اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق ۔۔۔۔ وہاں اپنی رہائش کا انتظام کیا۔ انگریز چونکہ سرد علاقوں کے پروردہ تھے اس لئے ۔۔۔۔ گرمی ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی دونوں برطانوی کالونیوں ۔۔۔۔ برصغیر اور ملائیشیا میں ٹھنڈی جگہیں تلاش کیں۔ پہاڑوں تک رسائی کر کے وہاں رستے نکالے ۔۔۔۔ سڑکوں کے جال بچھائے ۔۔۔۔ شاندار عمارتیں بنوائیں ۔۔۔۔ اپنے لئے رہائش گاہیں، انتظامیہ کے دفاتر ۔۔۔۔ عوام کیلئے تفریح گاہیں اور بیماروں کے لئے سینی ٹوریم بنوائے۔ مقامی لوگوں کو نچلے درجے پر بھرتی کیا اور ان کے لیے سرونٹ کوارٹرز تعمیر کرائے۔ یہ انگریز ہی تھے۔ جنہوں نے دوسروں کے ملک میں اپنی اجارہ داری رکھی ۔۔۔۔ حکومت خود کی اور ۔۔۔۔ مقامی لوگوں کو کامے بنا کے رکھا اور اپنی مرضی سے ۔۔۔۔ دوسروں کے دیس میں شاہانہ زندگی بسر کی اور مقامی لوگ صاحبِ حیثیت ہو کر بھی ان کے زیرِ اثر رہے۔

انگریزوں نے جس طرح برصغیر میں ۔۔۔۔مری ۔۔۔۔زیارت ۔۔۔۔میسوری ۔۔۔۔نتھیا گلی ۔۔۔۔فورٹ منرو اور سکیسر ۔۔۔۔شملہ وغیرہ میں ہل اسٹیشنز بنوائے۔اس طرح ملائیشیا میں بھی ان کا حسنِ ذوق اور حسنِ شوق کیمرون ہائی لینڈ ۔۔۔۔پینانگ آئس لینڈ اور دیگر ہل سٹیشنز کی صورت دکھائی دے رہا تھا۔کوالالمپور ۔۔۔۔ایپوہ ۔۔۔۔ملایا میں شاندار عمارتیں اس بات کی گواہ ہیں کہ اس ملک کو سنوارنے اور نکھارنے میں انگریزوں نے بڑا کام کیا تھا۔

جارج ٹاؤن مجھے بہت پسند آیا تھا۔

اس چھوٹے سے شہر میں برٹش کلونیل عمارتیں تھیں ۔۔۔۔ چائنیز شاپ ہاؤسز تھے ۔۔۔۔گئے وقتوں کا فوجی قلعہ تھا ۔۔۔۔مسجد، مندر اور بدھسٹ ٹیمپل تھے ۔۔۔۔ملی جلی اس معاشرت کی سنگت میں بے بہا قدرتی نظارے تھے۔

اس شہر کی گلیوں میں گھومتے پھرتے مجھے یہی لگا تھا ۔۔۔۔جیسے میں تاریخ کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی ہوں۔انہی تاریخی راہوں پہ چلتے چلتے مجھے جارج ٹاؤن اور ملائیشیا کے چوتھے بڑے آئس لینڈ کو خدا حافظ کہنا تھا کہ اب واپسی یقینی ہو گئی تھی۔دو بجے والی فیری سے ہماری بکنگ ہو گئی تھی۔جس نے ۔۔۔۔تین گھنٹے میں ہمیں پرلز (Perlis) پہنچانا تھا۔جہاں سے ہمیں بٹر ورتھ بس ٹرمینل (Butter Worth Bus Terminal) جانا تھا اور پھر ۔۔۔۔سری اسکندر کے لئے بس پکڑنا تھی۔

لتا کنجان

ڈرائیور ذہین وفطین ہو۔۔۔ مزاجاً رنگین ہو اور پھر۔۔۔ سیر وتفریح کا بھی شوقین ہو تو گاڑی اسی طرح فراٹے بھرا کرتی ہے جیسے یہ پروٹون طیارہ فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔

اونچی نیچی ڈھلوانوں پہ تیزی سے اترتے چڑھتے جب۔۔۔ گاڑی جھٹکے کھاتی تو دونوں لڑکیاں گھبرا کے اپنے بچوں کو سینے سے لگا لیتیں۔ اپنی بیگمات کو یوں ڈرتے دیکھ کے۔۔۔ افضال اور ان کے یونیورسٹی فیلو آصف کے قہقہے بلند ہو جاتے میں ان جھٹکوں اور قہقہوں سے بے نیاز، گھاٹیوں اور جنگلوں کے بیچ نکلتے رستوں کو۔۔۔ بھاگتے دیکھ رہی تھی۔ اور ملائیشیا کی بلند ترین آبشار تک رسائی کے تصور میں گم تھی۔ رستہ بہت ہی ٹیڑھا بانکا تھا تبھی۔۔۔ پچاس کلومیٹر کا فاصلہ تیز رفتاریوں کے باوجود دو ڈھائی گھنٹے میں طے ہوا تھا اور ہم۔۔۔ باتو گاجا اور کیلیز کیسل کے قرب و جوار سے گزرتے ہوئے اب۔۔۔ اس ممنوعہ سیرگاہ تک آ گئے تھے جہاں کئی بار پروگرام بننے کے باوجود۔۔۔ ہمارا پہنچنا ممکن ہی نہیں ہو سکا تھا۔

پہلی بار جانے کا ارادہ کیا تو تعبیر کے تِلیاں دھرنے کی وجہ سے منسوخ کرنا پڑا کہ بچی کی بے چینی دیکھ کے ہم سب ہی پریشان ہوئے جاتے تھے۔ دوسری بار پروگرام بنا۔۔۔ مکمل تیاری ہو گئی۔۔۔ کھانے بن گئے۔۔۔ سامان گاڑی میں رکھ لیا گیا مگر۔۔۔ گھر سے نکلتے ہی کن سوئیاں لینے والے ایک ایسے پاکستانی طالبِ علم سے سامنا ہو گیا جو۔۔۔ پردیس میں بھی اپنے ہم وطنوں سے شریکا برادری والوں کی طرح۔۔۔ ٹوہ لینے میں لگا رہتا تھا۔ ہمیں اس لمبے

روٹ پہ جاتے دیکھ کے اس نے ایک چُبھتا ہوا جملہ افضال کی طرف بھی اُچھال دیا تھا۔

"یار بھٹی صاحب! تسی تے اج کل ہوا دے گھوڑے تے سوار رہندے او۔"

ان کے اس جملے سے ہم تو یہ سوچ کے محظوظ ہوئے کہ۔۔۔ کچھ لوگوں کا پی ایچ ڈی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔۔۔ وہ کہیں چلے جائیں۔۔۔ کچھ بھی کر لیں۔۔۔ کچھ بھی پڑھ لیں۔۔۔ اُوت ہی رہتے ہیں مگر۔۔۔ افضال کی گاڑی کو اس پروفیسر کا یہ جملہ بہت چُبھا تھا اور وہ۔۔۔ بیچ رستے میں اَڑی کر گئی تھی۔ سنسان۔۔۔ ویران جگہ تھی۔ اس رستے میں نہ تو پبلک ٹرانسپورٹ دکھتی تھی اور نہ ہی۔۔۔ کوئی مکینک کہیں نظر آتا تھا۔ افضال کی بھرپور کوششوں کے بعد بھی جب وہ نہ مانی تو انہوں نے۔۔۔ اپنے انہی یونیورسٹی فیلو کو مدد کے لیے بلایا جو اس حالیہ سفر میں۔۔۔ ہمارے ہمسفر تھے۔ جب تک یہ ہماری مدد کو ہمارے پاس پہنچے تھے۔۔۔ تب تک۔۔۔ نیلے یونیفارم میں ملبوس ٹورسٹ پولیس والے بھی ہم تک پہنچ گئے تھے۔ یہ ادھوری سیر اتنی کوفت دے گئی تھی کہ پھر میں اس دیس میں شہروں شہروں گھومی مگر۔۔۔ لتا کنجان کا پروگرام دوبارہ نہ بن سکا تھا۔۔۔ اب کے کراچی کے اس مثالی جوڑے افشاں اور آصف کے پرزور اصرار پر یہ پروگرام بنا تھا اور الحمدللہ ہم پانچ نفوس پر مشتمل یہ قافلہ۔۔۔ اب اس ہموار سڑک تک آ پہنچا تھا جہاں۔۔۔ بڑے بڑے سائن بورڈ ہمیں منزل کا پتہ دیتے تھے اور۔۔۔ مختلف سائز کے پام قطار در قطار لہراتے ہوئے اپنے پر پھیلاتے تھے۔ جہاں ٹھنڈی ہوا قریب ہی یخ بستہ پانیوں کا سندیس دیتی تھی اور ترل ترل کی آواز ہماری سماعتوں میں رس گھولتی تھی۔ ہمارے بالکل سامنے بڑے سے گیٹ کے ماتھے پہ (TAMAN EKO RIMBA LATA KINJANG) کے جلی حروف سورج کی کرنوں سے لشکارے مارتے تھے۔

گیٹ کے ساتھ انفارمیشن ڈیسک تھا اور وہ رستہ بھی۔۔۔ جو ایکو فاریسٹ پارک

(EKO FOREST PARK) تک جاتا تھا۔ کھلے سے پارکنگ ایریا میں ایک طرف ٹوائلٹ اور شاور روم تھے اور دوسری طرف ایک چھوٹی سی نہر تھی۔۔۔۔ جو اپنی مدھم روانی میں بہتی جاتی تھی اور مجھے پاکپتن کی وُہ نہر یاد دلاتی تھی جس میں ہم کزنز۔۔۔۔ کاغذ کی کشتیاں بنا کے سپردِ آب کیا کرتے تھے اور پھر۔۔۔۔ اس تک وقت اپنی اپنی کشتی کو نظر کے حصار میں رکھتے تھے جب تک وہ ہمیں دکھائی دیتی رہتی تھی۔

ہم صبح نو بجے لتا کنجان واٹر فال پہنچے تھے۔

ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی یہاں جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ لوگ شاید صبح سانجھرے ہی یہاں چلے آئے تھے۔ ہم ڈھابوں، سوینئرز شاپس کے پاس سے ہوتے ہوئے رب سامنے کنکریٹ سے بنے اس ہموار رستے پہ آ گئے تھے جس کے۔۔۔۔ دامن سے نکلتی ہوئی سیڑھیاں ہوا میں مُعلق اس (SUSPENTION BRIDGE) تک جاتی تھیں جہاں سے ۔۔۔۔ اس آبشار کے دو طرفہ نظارے دکھائی دیتے تھے۔ ہم ان سیڑھیوں پہ قدم دھرتے جاتے تھے اور سامنے کائی زدہ گھنے، جنگل اور ہرے درختوں کے بیچ رستہ بناتی۔۔۔۔ اس بلند ترین آبشار کو تکتے جاتے تھے۔ جو آٹھ سو پچاس فٹ کی بلندی سے گنگناتی ہوئی، جھومتی گاتی ہوئی، پتھروں اور چٹانوں سے سر ٹکراتی ہوئی نشیب کی طرف آتی تھی اور دیکھنے والوں کو مسحور کر جاتی تھی ۔ رستے میں دائیں بائیں پھوٹتے بہت سے چشمے۔۔۔۔ پتھروں کا سینہ شق کرتے ہوئے اس آبشار میں آ گرتے تھے اور پانی کی روانی کو بڑھا دیتے تھے۔ پانی میں کھڑے لوگ اس تیز ریلے کی زد میں آ کر ذرا لڑکھڑا سا جاتے تھے مگر چند ہی لمحوں میں پھر۔۔۔۔ سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے قدم پانی پہ جما لیتے تھے۔ جب کہ یہاں کے مقیم قدیم جنگلی اورنگ اصلی، بڑی دلیری سے پانی پہ قدم دھرتے ہوئے، خطرناک چڑھائیاں بنا سیڑھیوں کے چڑھتے ہوئے۔۔۔۔ تیزی سے اوپر جاتے تھے اور ہم سے ڈرپوک سیاحوں کے بھی حوصلے بڑھاتے تھے۔ یہاں بہت

خطرناک پگڈنڈیاں اور چکنی پھسلواں چٹانیں تھیں۔ ان سے بچتے ہوئے ہم پختہ سیڑھیوں سے اوپر جا رہے تھے اور قدرت کے کف اڑاتے طلسماتی حسن کو دیکھ دیکھ حیرت زدہ ہو رہے تھے۔ رستے میں کچھ ہموار ٹیلے بھی آئے تھے۔ جہاں۔۔۔ لمحہ بھر کو ہم رُکے تھے اور ان خوبصورت مناظر کے ساتھ خود کو کیمرے کی آنکھ میں بند کر کے پھر بلندیوں کی طرف گام زن ہو گئے تھے۔ آخر میں بس افضال اور میں ہی وہ جی دار تھے۔۔۔ جو ان ٹیڑھے رستوں اور چکنی چٹانوں پہ قدم جماتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ ارم اور افشاں گود میں اپنے بچے اٹھائے مزید آگے جانے سے انکاری ہو کر ایک ہموار چبوترے نما چٹان پہ ڈیرے ڈال بیٹھی تھیں اور آصف ان کی رکھوالی کو ان کے پاس رُک گئے تھے۔

جنگل اور پہاڑ کے بیچ انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑی ہوئی۔۔۔ موتیوں جیسے شفاف پانی کی یہ آبشار لتا کنجان۔۔۔ سچ مچ قدرت کا ایک کرشمہ تھی۔ آسمان کی بلندیوں سے ذرا نیچے ایک بڑا سا فوارہ پھوٹتا تھا اور پہاڑوں۔۔۔ کے پتھر کناروں سے ٹکراتا ہوا نیچے گہرائیوں میں جا گرتا تھا۔ اس گرتے پانی کے جلترنگ من میں شور مچاتے تھے اور اس پانی کے کھوج پہ اکساتے تھے جو کہ جولائی کے مہینے میں بھی دسمبر کی یخ بستگی کی احساس دلاتا تھا اور جسے دیکھ کے دل ۔۔۔ اوپر اور اوپر جانے کو مچلتا تھا۔ اب سیڑھیاں ختم ہو گئی تھیں سو۔۔۔ کائی زدہ پتھروں پہ چڑھائی پاؤں پھسل جانے کا خوف تو دلاتی تھی مگر۔۔۔ لوگوں کو آگے جاتا دیکھ کے ہماری ہمت پھر بندھ جاتی تھی۔

کانوں میں یہی سرگوشی گونجنے لگتی تھی کہ۔۔۔

کون آتا ہے بار بار یہاں؟۔۔۔

کون آسکتا ہے بھلا بار بار ایسی جگہوں پہ؟

ان دشوار گزار راہوں پہ چلنا آسان تو نہ تھا مگر۔۔۔ شوق کشاں کشاں لئے جاتا تھا۔

اس جگہ جہاں پانی کی دھن جب موسیقی بکھیرتی تھی تو لگتا تھا۔

جیسے کسی مندر میں گھنٹیاں بجتی ہوں۔۔۔۔۔

جیسے کسی گلے سے آواز کی خوبصورت مُرکیاں نکلتی ہوں۔۔۔۔۔

جیسے دور کے سناٹوں میں سیٹیاں گونجتی ہوں

اور جیسے۔۔۔۔ادھر ادھر کی ساری دلکش وادیاں اس آبشار کے قدم چومتی ہوں۔

آبشار کی بغل میں دکھائی دیتا ہوا گھنا جنگل ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑاتا تھا اور ربڑ کے ٹوئیوں والے اس ملک کی خوبصورتی اور خوشحالی کا یقین دلاتا تھا کہ ملائیشیا کو۔۔۔۔اس وقت دنیا کا تیسرا بڑا قدرتی ربڑ پیدا کرنے والا ملک کہا جا رہا تھا۔

ملائیشیا میں بہت سے گھنے جنگل دیکھنے میں آئے مگر۔۔۔۔ان کی مُبہم پگڈنڈیوں کی بھول بھلیوں میں جانے کا کبھی سوچا تک نہیں۔ شُنید یہی تھا کہ ان جنگلوں میں گیا کبھی کوئی واپس نہیں آتا۔ سوائے اورنگ اصلی کے کیونکہ یہ جو باریک لکیروں سی پگڈنڈیاں۔۔۔۔جنگل میں جاتی دکھائی دیتی تھیں یہ آگے جا کے جانے کن اندھیروں میں گم ہو جاتی تھیں۔ اس کے بارے میں بس انہیں ہی خبر تھی۔ تبھی تو وہ بلا خوف و خطر آبشار اور جھرنوں کے بیچ مبہم رستوں کو گزرگاہ بناتے ہوئے۔۔۔۔برساتی نالے۔۔۔۔حوض۔۔۔۔تالاب عبور کرتے ہوئے جھٹ پٹ آگے بڑھتے جاتے تھے۔ اس وقت بھی بہت سے قدیم باشندے ہمارے اردگرد۔۔۔۔ان پانیوں میں قلانچیں بھرتے آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔

ان پتھروں پہ بمشکل قدم دھرتے ہوئے سانس کی لَے جب ذرا تیز ہوئی تو میں بھی کچھ لمحوں کے لئے۔۔۔۔ایک چھوٹے سے چبوترے پہ سانس بحال کرنے کو رُک گئی۔ چبوترے کی دیوار سے ٹیک لگائے میں ابھی آنکھیں موندنے بھی نہ پائی تھی کہ۔۔۔۔ایک مانوس خوشبو کی لپٹوں نے میری آنکھیں کھول دیں۔

میں نے خوشبو کے تعاقب میں نظر دوڑائی۔

اس چبوترے کے آخری سرے پہ دو بھکشو بدن پہ نارنجی رنگ کی چادریں لپیٹے۔۔۔۔ استرے سے سر منڈوائے۔۔۔۔ ناک پہ گول شیشوں کی عینک چڑھائے۔۔۔۔ پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں اڑائے۔۔۔۔ دھونی رمائے، سامنے چائے کے کلھڑ سجائے بیٹھے تھے۔ ہوا کے جھونکے اس خوشبودار بھاپ کو اڑاتے تھے اور جب یہ خوشبو نتھنوں سے ٹکراتی تھی تو چائے کی طلب بڑھتے قدم روک دیتی تھی۔ میرے قدموں نے بھی آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ چائے جو بچپن میں مجھے کبھی پسند نہیں رہی تھی۔ اب میرا بھی پسندیدہ مشروب بن گئی تھی۔

کبھی یہ چائے انگریزوں کی ادا اور عطا سمجھی جاتی تھی مگر۔۔۔۔ تاریخ نے یہ دعویٰ جھٹلا دیا تھا اور چائے کی دریافت کا سہرا برطانیہ کی بجائے چین کے سر سجا دیا تھا کہ۔۔۔۔

چین میں تو چائے قدیم زمانوں سے غالباً ہزاروں برس پہلے سے استعمال ہو رہی تھی۔ یہ تو آبی تجارتی گزرگاہوں سے ہوتی ہوئی انگریزوں تک پہنچی تھی اور۔۔۔۔ وہاں کے لوگوں کی زندگی کا لازمی جزو بن گئی تھی۔ تبھی اس کی مانگ اتنی بڑھ گئی تھی کہ۔۔۔۔ انگریزوں کو اسے حاصل کرنے کے لئے چینیوں کے بے جا نخرے بھی برداشت کرنا پڑے تھے۔ چینی جب چاہتے تھے ۔۔۔۔ چائے کے نرخ بڑھا دیتے تھے۔ مجبوراً انگریزوں کو یہ منہ مانگی قیمت چکانا پڑتی تھی جو انہیں۔۔۔۔ بہت شاق گزرتی تھی۔

انگریزوں نے تب اپنے شاطرانہ دماغ سے کام لیتے ہوئے چینیوں کی جاسوسی شروع کر دی اور سیر و تفریح کے بہانے کچھ انگریز چین بھیجے گئے۔۔۔۔ وہ وہاں مختلف چائے کے باغات میں گھومے پھرے۔۔۔۔ وہ جس باغ میں بھی جاتے وہاں سے۔۔۔۔ چائے کے کچھ نمونے چرا لیتے۔۔۔۔ ٹہنیاں پتیاں خورد برد کر لیتے۔ تین مہینے کی مسلسل تگ و دو کے بعد وہ بہت سا خفیہ خزانہ لے کر واپس لوٹے تاکہ۔۔۔۔ چائے کی کاشت کا تجربہ کر سکیں۔ ان کے اس

پلان کو برطانوی پلانٹرز نے کامیابی سے ہمکنار کیا اور مطلوبہ نتائج حاصل کر لئے۔ چائے کی اس حیرت انگیز پیداواری ترقی نے جہاں انگریزوں کو چائے میں خود کفیل کر دیا وہاں برصغیر میں بھی چائے کو عام کیا اور یہاں کے لوگوں میں چائے کی عادت کو پختہ بنا دیا۔ پہلے چائے صرف بیماروں کے لئے بطور دوا تجویز اور استعمال کی جانے لگی اور پھر۔۔۔۔ مالداروں۔۔۔۔ جاگیرداروں کے محل میناروں سے ہوتی ہوئی مزدوروں اور بے کاروں تک بھی آ گئی اور اب تو ۔۔۔۔ یہ حال ہے کہ ہمارے ملک کے وہ گاؤں۔۔۔۔ جہاں لسی اور دہی کبھی ناشتے کا لازمی جزو ہوا کرتی تھی وہاں بھی۔۔۔۔ صبح چائے کے بغیر نمودار ہی نہیں ہوتی۔

وہ دونوں بھکشو چائے کے گھونٹ بھرتے رہے اور میں تاریخ میں تاک جھانک کرتی۔۔۔۔ مزید چڑھائی، چڑھتے ہوئے اس پُل تک آ گئی جس کی خستہ حالی مجھے وہاں جانے سے ہولاتی تھی مگر۔۔۔۔ بہت سے لوگوں کی پل تک رسائی مجھے وہاں جانے پہ اکساتی تھی۔ دو میٹر چوڑا یہ پل مضبوط لکڑی کے تختے جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ جس کے دونوں طرف مضبوط جالیاں سیاحوں کی حفاظت کو لگائی گئی تھیں۔

میں ان جالیوں پہ آنکھیں دھرے بہتے جھرنوں کی روانی اور۔۔۔۔ پانی کی جولانی دیکھتی تھی اور ان جادوئی کرشموں پر۔۔۔۔ سبحان تیری قدرت کہتی جاتی تھی۔ دودھیا جھاگ اڑاتی یہ آبشار اس بے تابی سے نیچے کی طرف گرتی تھی کہ کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا۔ آبشار کی یہ دیوانگی منچلوں کو بھی خبردار کرتی جاتی تھی۔ اس پُر شکوہ آبشار کے دونوں طرف کے منظر پُل سے بہت حیرت انگیز دکھتے تھے۔ دور کھیرپُل کی سرخ چھتیں زندگی کا پتہ دیتی تھیں۔ چشموں سے پانی پھوٹتا تھا تو جی میں۔۔۔۔ پھلجڑیاں سی چھوٹنے لگتی تھیں۔

پانی سے پانی کا ملن بہت سندر لگتا تھا۔

مختلف دھاروں میں بہتے نکلتے یہ قدرتی چشمے ڈھلوانوں پہ اترتے اور بے تابی سے

ایک دوجے میں ضم ہو جاتے تھے۔

بہت سے جی دار پانی کے ان تیز ریلوں کے ساتھ۔۔۔۔پھسلتے ہوئے نشیب کی طرف جب لڑھکتے تو خوب ہاؤ ہو مچاتے تھے۔اس وقت بھی لوگوں کی خاصی تعداد لتا کنجان واٹر فال سے لطف اندوز ہو رہی تھی مگر۔۔۔۔ٹوئن ٹاورز کی طرح ایک ہی جگہ پر ان سب کا جمگھٹا نہیں لگا تھا بلکہ یہاں تو دور دور تک لوگ۔۔۔۔بیروں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔اپنی اپنی ہمت کے مطابق جو جتنی اونچائی تک جا سکتے تھے۔۔۔۔پہنچ گئے تھے۔کچھ پانی سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔کچھ ہموار ٹیلوں پہ پکنک منا رہے تھے اور کچھ خشک۔لکڑیوں کا الاؤ دہکائے سیخوں پہ مرغ چڑھائے باربی کیو کے مزے لوٹ رہے تھے۔

ٹھنڈی ہوائیں پھر ایک دم کالی گھٹاؤں میں بدل گئی تھیں مجھے معروف شاعر ۔۔۔۔مجید امجد کی نظم کے کچھ مصرعے یاد آنے لگے تھے۔

کنارِ دل سے حد افق تک
تمام بادل گھنیرے بادل

شراب کی مستیوں کے جھونکے
گلاب کی پنکھڑیوں کے آنچل

خیال رم جھم نگاہ جل تھل
جب چاہیں برس چاہیں

بادل سرکشی پہ آجائیں تو کب رکتے ہیں؟
یہ تو جہاں چاہیں جب چاہیں برس جائیں۔

مگران کے برسنے سے پہلے ہی ہم نے واپسی کے لیے قدم موڑ لئے تھے اور اپنے بھوک سے بلبلائے اور۔۔۔۔غصے سے تلملائے ساتھیوں سے آن ملے تھے جنہیں ہماری وجہ سے۔۔۔۔بھوک برداشت کرنا پڑی تھی بہت انتظار کرنا پڑا تھا۔۔۔۔بھوک برداشت کرنا پڑی تھی۔ میں لتا کنجان پہ الوداعی نظر ڈال کے پلٹ رہی تھی کہ ایک جھرنے کے چمکتے رنگین پتھروں نے۔۔۔۔مجھے روک لیا۔ میں نے یخ بستہ پانی میں ہاتھ ڈالا اور ان پتھروں کو اپنی مٹھی میں بھر لیا۔ ہتھیلی پہ انہیں پھیلایا۔ کچھ دیر انہیں دیکھا اور ان میں سے ایک میرون اور دوسرا سرمئی دھاری دار پتھر اٹھا کر باقی پتھر اسی جھرنے کو واپس لوٹا دیے۔ ارم کی آواز پہ میں نے واپسی کے لئے قدم بڑھائے مگر پھر رک گئی کہ میرا جھرنے کو واپس لوٹایا ہوا ایک پتھر۔۔۔۔اپنے یوں ٹھکرا دیئے جانے پر آڑا ترچھا ہو کر ایک طرف غمزدہ پڑا مُجھے دیکھ رہا تھا۔۔۔۔میں نے لپک کے اس زرد پتھر کو بھی اٹھایا اور لتا کنجان کی خوبصورت یادوں کی نشانی جان کر اس کے ساتھیوں کے ساتھ اپنی مٹھی میں بھینچ لیا اور۔۔۔۔بچوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

کھانا ہم نے آبشار کے قدموں میں بنے فردوس ماجو ریسٹورنٹ میں کھایا۔ کھانا ہم ساتھ لے کر آئے تھے۔ دونوں لڑکیوں نے کھانا اچھا بنایا تھا۔ خاص طور پر افشاں نے دم کا قیمہ بہت لذیذ تیار کیا تھا۔ اس ریسٹورنٹ سے تو ہم نے صرف میٹھے کارن ہی لیے تھے جو۔۔۔۔بہت مزے کے تھے مگر وہ میٹھے کارن۔۔۔۔اچانک ہی کڑوے اور بدمزہ لگنے لگے تھے۔ جب ایک باؤلی سی مَلَن I Hate Pakistani کا نعرہ لگاتی ہم پاکستانیوں کے سامنے آ گئی تھی۔

اس کے نعرے نے ہمیں حیرت زدہ تو کیا تھا مگر۔۔۔۔اس کی اُجڑی اُجڑی رنگت اور بھیگی بھیگی آنکھیں بہت سے بھید بتا گئی تھیں۔

پھر وہی پرانی کہانی!

پھر وہی روایتی دھوکا!

اپنا آپ بنانے کو دوسروں کے جذبوں سے کھلواڑ کی وہی پرانی داستان!

ایک شخص کی بددیانتی پوری قوم کی رسوائی بن جاتی ہے۔ مجھے شرمندگی ہونے لگی۔

دوسروں کو دھوکا دے کر لوگ کیسے پرسکون رہ سکتے ہیں؟

کسی کی دنیا جاڑ کر۔۔۔۔ کسی کے خواب چکنا چور کر کے کیسے چین سے جی سکتے ہیں۔

اس ملّے لڑکی کی شعلہ بار آنکھیں اب ہر پاکستانی کو اپنا مجرم سمجھ رہی تھیں۔ میں نے اس سے کچھ پوچھنے کچھ ٹٹولنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بنا جانے۔۔۔۔ بنا پوچھے ہی بات سمجھ میں آ گئی تھی اور یہ بات۔۔۔۔ میرا دل بوجھل کر گئی تھی۔

لتا کنجان نے جہاں میری آنکھیں چشموں، جھرنوں اور آبشار کے خوبصورت نظاروں سے بھر دی تھیں وہیں چلتے چلتے۔۔۔۔ یہ ملّے لڑکی دکھ کی کسک بھی دے گئی تھی۔ میں یہ کسک سمیٹے فردوس ماجو ریسٹورنٹ سے نکلی اور اس باغ کی طرف چلی آئی جہاں۔۔۔۔ دریان کے وہ درخت سر اٹھائے کھڑے تھے جن پہ۔۔۔۔ نوکیلے کانٹوں والا وزنی پھل کھجور کے درخت کی طرح بہت اونچائی پہ لگا ہوا تھا۔ لوگ ان درختوں کو دور دور سے ہی دیکھتے تھے کہ اچانک یہ نوکدار پھل گر سکتا تھا اور یہاں آئے لوگوں کو زخمی بھی کر سکتا تھا۔ حکیموں سنیاسیوں کی دواؤں میں استعمال ہونے والے اس پھل کو اتارنے میں تجربہ کار بندر مددگار بنتے تھے۔ اب بھی بندر ادھر ادھر پھدکتے دکھائی دے رہے تھے۔ لہسن کے ذائقے والا دریان شوق میں چکھ تو لیا تھا مگر۔۔۔۔ منہ میں کسیلا پن گھول گیا تھا۔

قافلے واپس پلٹنے لگے تھے۔ جس جاء صبح میں میلہ لگا ہوا تھا۔ شام اترنے سے پہلے اب وہاں سناٹے گونج رہے تھے۔ میں نے دیکھا! لتا کنجان کے آس پاس اداسی بال کھولے

کھڑی تھی۔ تیز ہواؤں کے شور میں جھرنوں کا مدھر شور کہیں گم ہو گیا تھا۔ شاخوں سے ٹوٹے زرد پتے گاڑیوں کے پہیوں تلے آ کے واویلا کرنے لگے تھے اور ہم اس اداس خاموشی سے باتیں کرتے کرتے اب ایپوہ آ گئے تھے کہ یہاں کے (KHENG LIM CHINESE RESTAURANT) میں خاص ڈنر کا اہتمام اس ماں کے اعزاز میں کیا گیا تھا جسے اب ۔۔۔۔واپسی کے لئے اڑان بھرنا تھی۔

خاص مصالحوں سے بنا۔۔۔۔ جڑی بوٹیوں کی خوشبو میں بیک کیا گیا۔۔۔۔چھوٹے سائز کا سالم چکن عمدہ ریپر میں لپٹا ہوا۔۔۔۔لذت میں بھی اپنی مثال آپ تھا۔ میں نے ایسا ذائقہ پہلے نہیں چکھا تھا۔ یہ خاص ڈنر کرتے ہوئے میں نے سوچ رہی تھی۔

پتہ نہیں زندگی ہمارا پیچھا کرتی ہے یا ہم زندگی کا۔۔۔۔

مگر اس چھوٹے سے جیون میں بعض تعلق۔۔۔۔بعض رشتے ایسے ضرور ہوتے ہیں جو جگنو بن کے چمکتے ہیں اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی کرن بن جاتے ہیں۔ یہ جگنو۔۔۔۔ سکھی سہیلیاں ہوتے ہیں۔ یہ جگنو۔۔۔۔ بیٹے بیٹیاں ہوتے ہیں۔ یہ جگنو۔۔۔۔ہمارے سچے اور پیارے رشتے ہوتے ہیں۔ میں انہی جگنوؤں کے سنگ۔۔۔۔محبتوں میں رچی بسی اس پرائے دیس میں۔۔۔۔شہروں شہروں گھومتی رہی تھی اور اب۔۔۔۔۔

اب واپسی کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔

یادوں کی خوش کن نفیری

آنکھ کھلی تو ابھی سپیدۂ سحر نمودار نہیں ہوا تھا۔

میں حسبِ معمول باہر باغیچے میں چلی آئی تو خنک ہوا بارش کی نوید دے رہی تھی۔ رات بادل کب برس گئے؟ خبر ہی نہ ہوئی تھی مگر درختوں کے پتوں کی نوک سے بوند بوند گرتا پانی بارش کے بھید کھول گیا تھا۔

میں جب سے یہاں آئی تھی ہر روز صبح سانجھرے۔۔۔ کچھ دیر ان سرمئی سڑکوں پر ٹہلتی۔ مختلف گھروں کے باہر رکھے پودوں کی ترتیب اور سجاوٹ سے۔۔۔ اس گھر کے مکینوں کے ذوق کا اندازہ لگاتی اور مختلف پرندوں کی سرگوشیاں سُنتے ہوئے۔۔۔ واپس پلٹ آتی۔ باہر ابھی سناٹا تھا مگر پرندوں کی چہچہاہٹ اس سناٹے کو توڑ رہی تھی۔ لان میں ایک ننھی سی چڑیا اپنی گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے پھُدکتی پھر رہی تھی۔ جو کبھی پتوں پہ ٹھہرے پانی کو اپنی ننھی سی چونچ میں بھرنے کی کوشش کرتی تھی اور کبھی۔۔۔ خوفزدہ سی ادھر ادھر دیکھنے لگتی تھی۔

مجھے لگا! مجید امجد نے شاید ایسی ہی کسی چڑیا کو دیکھ کے یہ نظم کہی ہوگی۔

صبح سویرے بن کی چڑیا من کی بات بتائے
جنگل میں سرکنڈے کونپل پر بیٹھی گائے

ننھی چونچ پہ چوں چر چوں چر چوں کی چونچل بانی
کرن کرن پہ ناچ رہی ہے اس کے من کی کہانی

کیا گاتی ہے؟ کیا کہتی ہے؟ کون اس بھید کو کھولے؟
جانے دور کے کس ان دیکھے دیس کی بولی بولے؟

بن کی یہ چڑیا کیا گا رہی تھی؟ کس ان دیکھے دیس کی بولی بول رہی تھی؟

یہ تو مُجھے خبر نہیں تھی! ہاں میں یہ ضرور سوچ رہی تھی کہ اپنے دیس جا کر۔۔۔ میں اس دیکھے گئے دیس کی بولی ضرور بولوں گی،

بن کی چڑیا کے گانے کا بھید تو شاید نہ کھول سکوں مگر۔۔۔ اس ملک میں گزارے ہوئے دنوں کی گٹھڑی ضرور کھولوں گی۔

جہاں میں نے۔۔۔ پہاڑوں پر برستی موسلا دھار بارش دیکھی، ان پہاڑوں کی ترائیوں میں۔۔۔ نیلی جھیلوں اور آبشاروں سے گرتے پانی کا مترنم شور سنا اور اس بارش کے ریلے میں۔۔۔ بہہ کر آنے والے پتھروں کے آپس میں ٹکراؤ کی کھنک بھی محسوس کی میں نے ۔۔۔ بارش کے تھم جانے کے بعد یہاں کے جنگلی پرندوں کا رقص بھی دیکھا۔۔۔ ان پرندوں کی چہچہاہٹ اور ان کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنی اور پھر ان پرندوں کو سبزے پہ بکھری بارش کے قطرے چنتے ہوئے دیکھا، موروں کو چنگھارتے اور آبی گلوں کو۔۔۔ مرغابیوں کو ۔۔۔ ٹھنڈے میٹھے پانیوں میں۔۔۔ جھومتے ہوئے اپنا عکس بکھیرتے دیکھا۔ میں نے اس دیس کی نورانی صبحوں میں پرندوں کی میٹھی گفتار سُنی اور۔۔۔ ڈھلتی شام کی لالی میں انہیں آشیانوں کی طرف پلٹتے دیکھا۔

گھروں کو پلٹنے کا یہ والہانہ سفر بھی عجیب ہوتا ہے۔

گھر۔۔۔ جو ہر ذی روح کے لئے تحفظ کا گھوارہ ہوتا ہے۔ چرند، پرند ہوں یا انسان وہ جہاں بھی جائیں، گھر واپس لوٹنے کی خوشی انہیں نہال کر دیتی ہے۔

مُجھے بھی گھنے جنگلوں۔۔۔ پہاڑوں۔۔۔ آبشاروں۔۔۔ جھیلوں۔۔۔ نیلے پانیوں اور چھما چھم برستی بارشوں والے اس دیس نے بہت سرشار کیا تھا اور اب۔۔۔ گھر لوٹنے کی خوشی بھی مُجھے نہال کئے ہوئے تھی۔ گہرے سمندروں اور مترنم جھرنوں والے اس دیس سے رخصت ہونے کا وقت آ گیا تھا۔

میں سری اسکندر کی اس صبح کو اپنی آنکھوں میں بھر رہی تھی کہ نئی صبح نمودار ہونے سے پہلے مُجھے اس پرسکون بستی کو چھوڑ دینا تھا۔

جی میں ہلکا سا ملال ہوا۔

یہ بادل جو رات کو ٹوٹ کے برسے، اگر اب برس جاتے تو میں یہاں کی آخری بارش بھی دیکھ لیتی۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ خواہش۔۔۔ ابھی سر بھی نہیں اٹھا پاتی اور پوری ہو جاتی ہے۔ بس ایسا ہی ہو گیا تھا۔

سورج کی نمودار ہوتی ہوئی کرنوں کو پل بھر میں۔۔۔ اندھیرے نے شکست دے دی تھی اور گہرے سرمئی بادلوں نے دن میں رات کا سماں باندھ دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ سیاہ بادل سرکشی پہ اترتے۔۔۔ میں تیز قدموں سے واپس پلٹی اور اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے ٹیک لگائے ان برستے بادلوں کا نظارہ کرنے لگی جو ایک پردیسن کی خواہش کا مان رکھنے کو۔۔۔ چھاجوں مینہ برسا گئے تھے۔

ناشتے کے بعد بیٹی کام سمیٹتی پھر رہی تھی۔

میری تیاری۔۔۔۔اپنی تیاری اور پھر اس تقریب محبت میں شرکت کی تیاری بھی کر رہی تھی جسے۔۔۔۔ملن کے خوبصورت موڑ تک لانے میں پاکستانی نوجوان طالب علموں نے کئی دنوں سے اپنے سر جوڑ رکھے تھے۔

دوپہر میں نعمان اور سارہ کا نکاح تھا۔ یہ دونوں پاکستانی جو اپنے دیس کے۔۔۔۔دو الگ الگ صوبوں سے تعلق رکھتے تھے۔

ملائیشیا میں کلاس فیلو بن گئے تھے اور جب۔۔۔۔پہچان کے دائرے وسیع ہوئے تو دونوں کی آنکھیں۔۔۔۔ملن کے خواب بننے لگی تھیں۔ اس خواب کے بارے میں دونوں نے ۔۔۔۔اپنے اپنے گھر والوں کو بتا بھی دیا تھا مگر ہوا وہی۔۔۔۔جو ہمیشہ سے ان معاملات میں ہوتا آیا ہے۔ کہیں ذات پات کے مسئلے کھڑے ہو جاتے ہیں تو کہیں برادری اور اَنا کے معاملے آڑے آتے ہیں۔ نعمان کے گھر والے تو بیٹے کی خوشی میں خوش تھے مگر سارہ کے گھر والے۔۔۔۔میمن برادری کے علاوہ کہیں اور سارہ کی شادی کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔

مجھے ایسے ماں باپ کبھی اچھے نہیں لگے۔۔۔۔جو بچوں کی ہر ضد پوری کریں۔۔۔۔ ہزاروں میل دور تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیج دیں مگر ان کی زندگی کے اہم فیصلے کا حق اپنے پاس رکھیں۔

جانے کیوں ایسے میں ان والدین کی ساری روشن خیالی بھک سے اُڑ جاتی ہے۔ وہ جن بیٹیوں کو ناز و نعم سے پالتے ہیں۔ انہیں اپنی ہی ناسمجھی سے بغاوت اور نافرمانی پر اُکسا دیتے ہیں۔ بیٹیاں کبھی والدین کی عزت کو خاک میں نہیں ملانا چاہتیں بس یہ بغاوت انہیں مشتعل کر جاتی ہے اور پھر مجبور اُوہ۔۔۔۔ایسا قدم اٹھا لیتی ہیں جو وہ اٹھانا نہیں چاہتی تھیں۔

سارہ بھی بغاوت پر اتر آئی تھی اور اس نے اپنا مسئلہ۔۔۔۔اپنے پاکستانی کلاس فیلوز کے سامنے رکھ دیا تھا۔ تب سب ساتھیوں نے اس کا ساتھ دیا تھا اور اس شادی کو۔۔۔۔اسے

بھرپور پاکستانی انداز میں منانے کا فیصلہ کیا تھا۔اس دن سب لڑکوں نے ٹین کے کنستر اور گھر کی پراتیں بجا کے ماہیے، ٹپے گاتے ہوئے، اور اس چھوٹے سے قصبے کو سر پہ اُٹھالیا تھا۔رات بھر ہماری پاکستانی شاہزادیاں خوب بن ٹھن کے سارہ کو مہندی لگاتی اور الوداعی گیت گاتی رہی تھیں۔

بارش کے بعد نکلنے والی دھوپ بڑی چبھن دیتی ہے مگر اس چلچلاتی چبھتی ہوئی دھوپ میں بھی ہماری پاکستانی دوشیزائیں میک اپ زدہ چہروں کے ساتھ ریشمی لبادوں میں اٹھلاتی پھر رہی تھیں۔

مجھے یہ کم خرچ بالانشین شادی بہت مزے کی لگی۔

سادگی سے نکاح ہوا۔۔۔۔یونیورسٹی کے ڈائننگ ہال میں ہم سب نے کھانا کھایا اور ۔۔۔۔سارہ کو رخصت کر دیا۔الوداعی دعائیہ کلمات اس پردیسن ماں نے ادا کیے۔

میری بھی یہ سب سے الوداعی ملاقات تھی۔

کچھ دعائیں میں نے سارہ کی جھولی میں ڈال دیں اور پھر۔۔۔۔وہاں موجود سب چھڑوں اور بیاہتا جوڑوں کی محبتوں کا شکریہ ادا کیا۔جنہوں نے اس دیس میں ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔

میں ڈیڑھ ماہ سے ملائیشیا میں تھی۔اس دوران میں نے کئی ریاستیں دیکھیں۔۔۔۔ چھوٹے بڑے شہروں اور جزیروں میں گھومی پھری۔ ٹیلوں۔۔۔۔ ڈھلوانوں ۔۔۔۔ غاروں۔۔۔۔ پہاڑوں۔۔۔۔جنگلوں اور آبشاروں کو دیکھا۔۔۔۔ پرندوں کی چہکار سنی۔۔۔۔ جنگلی پھولوں کی مہکار چنی۔ گھنے جنگلوں میں گم ہوتا ہوا سورج دیکھا۔سمندر کی گود سے ابھرتی صبح دیکھی۔۔۔۔نیلے سمندر کے پانیوں کی وسعتوں پہ۔۔۔۔ نیلے آسمان کی تنی چادر دیکھی۔گام گام بکھرا قدرت کا لازوال حسن دیکھا اور حسن کے ان جلوؤں میں خالق کائنات کے پرتو کی جھلک سمیٹی۔

میں جہاں بھی گئی، دل سے سبحان اللہ کی صدائیں نکلتی رہیں اور میری آنکھیں رب کریم کی بے بہا نعمتوں پہ بہ طور تشکر چھلکتی رہیں۔

میں نے یہاں سادگی دیکھی ۔۔۔۔ بھائی چارہ دیکھا ۔۔۔۔ قانون کی پاسداری کرنے والے لوگ دیکھے ۔۔۔۔ عورت کی عزت وتکریم دیکھی ۔۔۔۔ میں نے یہاں فیشن کا سیل رواں نہیں دیکھا۔ عورتیں یہاں مجھے ۔۔۔۔ اپنے روایتی لباس سارنگ میں لپٹی سمٹی ۔۔۔۔ زندگی کے ہر شعبے میں کام کرتی دکھائی دیں۔ تبھی یہ ملک ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں شامل ہوا۔

پیٹروناس یونیورسٹی کے ٹریک اس وقت قدرے خالی تھے۔ کہیں کہیں لوگ آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ شام کے چھ بجنے کو تھے مگر ۔۔۔۔ دھوپ کی چبھن اور گرمی کی شدت کم نہیں ہوئی تھی عموماً ہم شام ڈھلے یہاں آتے تھے۔ مگر اب جلدی آنے کی وجہ مچھلیوں کو الوداعی خوراک ڈالنا تھی۔ ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنا تھا۔ میں یہاں جب آئی تھی تو میری پہلی سیر گاہ یہ یونیورسٹی تھی۔ اور اب آخری سیر گاہ بھی یہی یونیورسٹی ٹھہری تھی۔ تبھی دھوپ اور گرمی کی پرواہ کیے بغیر میں یہاں چلی آئی تھی۔ ہمارا تو یہ معمول ہی بن گیا تھا کہ جب سری اسکندر سے کہیں جانے کا پروگرام نہ ہوتا تو ۔۔۔۔ سر شام اس جھیل کنارے چلے آتے تھے۔ مغرب کی نماز یونیورسٹی کی مسجد میں پڑھتے اور ٹھنڈی میٹھی ہواؤں کے جھونکوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے واپس پلٹ جاتے مگر واپس گھر جانے سے پہلے امیت کے ہوٹل ضرور جاتے تھے کہ یہ چھوٹا سا ہوٹل ۔۔۔۔ سری اسکندر کا جم خانہ تھا۔ جہاں یونیورسٹی کے طلبہ کو اپنا من بھاتا کھاجا ۔۔۔۔ سستے داموں مل جاتا تھا۔ ایپوہ سے چالیس میل دور شمال مغرب کی جانب یہ قصبہ سری اسکندر شاہ کے نام پر آباد کیا گیا تھا۔ جس نے 1918ء سے 1935ء تک اس ریاست پر حکمرانی کی تھی۔ جب یونیورسٹی بنی تو یہ قصبہ ۔۔۔۔ دیس دیس کے لوگوں سے بھر گیا۔ یہاں اس قصبے میں امیت کا ہوٹل ہی تھا جہاں ۔۔۔۔ رات گئے تک آر جار لگی رہتی تھی اور دیسی بدیسی گاہک کرسیوں پر براجمان

کھلی فضا میں بڑی سی سکرین پر فلمیں دیکھتے رہتے اور ناسی لیمک (Nasi Lemak)، کری ایان (Curri Ayan)، اور کری گولک (Curri Golak) سے لُطف اندوز ہوتے اور آخر میں ٹائے پناس کی چسکیاں لیتے ہوئے واپسی کا رخ کرتے۔ امیت کے ہوٹل پہ مرید کے (پاکستان) سے آیا ہوا ویٹر طاہر۔۔۔ پاکستانیوں کی آؤ بھگت میں پیش پیش رہتا تھا اور خاطر داری میں بچھا جاتا تھا۔

میں نے اس کا والہانہ پن دیکھ کے سوچا! یہ وطن کی محبت کب چین لینے دیتی ہے؟ بندہ روزی روٹی میں اُلجھ کے بھی وطن کی مٹی کا اسیر رہتا ہے۔

جھیل کے صاف پانی میں روپہلی چمکتی ہوئی مچھلیاں جب۔۔۔ خوراک لینے کو لپکتی جھپکتی۔۔۔ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کو مچلتیں تو مچھلیاں۔۔۔ جھیل کے پانی کو بے چین سا کر جاتیں۔ پھر دیر تک پانی میں دائرے در دائرے بنتے رہتے۔ جونہی لمحہ بھر کو یہ پانی۔۔۔ اگر ساکن ہو جاتا تو یہ مچھلیاں۔۔۔ پھر غوطہ زنی سے ارتعاش پیدا کر کے اس پانی کو مُضطرب کر جاتیں۔ مچھلیوں کو دانہ پانی میں آنکھ مچولی کرتے دیکھ کے میں نے اک الوداعی نظر ان پہ ڈالی اور ٹریک کے دوسری طرف چلی آئی جہاں۔۔۔ اوپر پرندوں کی ڈاریں اپنے آشیانوں کی طرف واپس پلٹ رہی تھیں۔

یہ واپسی کا سفر تو ہر اک کا مقدر ٹھہرا۔ میں نے سوچا!

کوئی دنیا میں آئے یا کسی ملک میں، شہر میں آئے یا قصبے میں۔۔۔ واپس جانا تو لازم ٹھہرا، خواہ اس کا جی چاہے یا نہ چاہے۔ واپس جانا تو لازم ٹھہرا۔

اور پھر۔۔۔ جی کا کیا ہے؟ یہ تو ازل سے باؤلا ہے۔ من مانیوں پہ اترے تو کب سنتا ہے کسی کی۔

یہ میرے جی کی من مانی ہی تو تھی جو میں ہزاروں میل کا سفر طے کر آئی تھی۔

اس سنہری شام میں ۔۔۔۔ جونہی میں نے ٹریک کے پاس دانہ بکھیرا جانے کیسے ۔۔۔۔ گھر جاتے پنچھیوں کو اس کی خبر ہوگئی اور میرے آس پاس رنگ برنگے طوطے ۔۔۔۔ کالی سیاہ مینائیں ۔۔۔۔ فاختائیں ۔۔۔۔ بلبلیں ۔۔۔۔ خاکستری پروں اور ننھی ننھی آنکھوں والی چڑیاں دانہ چگنے چلی آئیں۔ یہ سب ننھی جانیں اپنی گول گول آنکھوں سے دائیں بائیں تاکتے ہوئے چونچ میں دانہ بھرتیں مگر جونہی اور ذرا سی آہٹ محسوس ہوتی تو پھُر سے اڈاری مار جاتیں۔ ہوا سے پتہ بھی سرسراتا تو یہ ۔۔۔۔ چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگتیں۔ میں لکڑی کے خوبصورت بینچ پر بیٹھی ان کا کھیل دیکھتی رہی اور دور کہیں ۔۔۔۔ بہت دور دکھیاری کوئل کی درد بھری کوک میرا دل برماتی رہی۔ یہاں تک کہ دھوپ کا آخری لپکا بھی اپنی جھلک دِکھلا کے غائب ہو گیا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا تو دور جہاں زمین اور آسمان کے کنارے ملے ہوئے تھے وہاں سورج بنفشی رنگ کی لکیر بنا آسمان کے آخری کونے پہ بکھرا ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے یہ لکیر بھی اندھیرے میں گم ہوگئی۔ میں نے جنگل اور درختوں کے بیچ دمکتی ہوئی ملائیشیا کی یہ آخری شام بھی ۔۔۔۔ آنکھوں میں بھر لی اور اٹھ کھڑی ہوئی ۔۔۔۔ اندھیرے میں لپٹی ہوئی اس مادرِ علمی کو ۔۔۔۔ جی بھر کے دل پہ نقش کیا اس خوبصورت شام کے حسن کو سَراہا اور سوچا! علامہ اقبال کے ان اشعار کے تناظر میں خوبصورت شام کو اپنے اشعار میں ڈھالا ہوگا۔

علامہ کے ان اشعار کو زیرِ لب دہرایا:

سورج نے جاتے جاتے اس شام سیہ قبا کو
طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے

پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اُتارے

اور اماں درشن سے ملنے چلی آئی۔

اماں درشن سے الوداعی ملاقات میں نے تاروں کی جھلملاہٹ میں کی تھی کہ دوبارہ کہیں بھی۔۔۔اک دوجے سے ہمارا ملنا ممکن کب تھا؟

محبت کے چند جھلملاتے دِیے۔

پلکوں پہ جلے ہم دونوں کی دل کا درد سوا ہو گیا ہم وہاں سے نکلے تو۔۔۔امیت کے ہوٹل پہ چلے آئے تھے کہ یہاں کی تازہ ہوائیں۔۔۔سڑک کنارے بچھی کین کی کرسیوں پر بھی کچھ دیر بیٹھنا تھا اور پھر۔۔۔کبھی یہاں نہ آنے کے لئے اٹھ جانا تھا۔ ویٹر طاہر سے ملنا تھا اور اس کی اپنی ماں کے لئے بھیجی گئی سوغاتوں کو سنبھالنا تھا اور پھر کچھ ہی دیر بعد۔۔۔کوالالمپور کے لئے روانہ ہو جانا تھا۔

من میں ہجر و فراق کے قافلے رواں تھے۔ان قافلوں میں یادوں کے چلتے ہوئے اونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ ان گھنٹیوں کی آواز میرے اندر کے صحرا کو سوگوار کئے ہوئے تھی۔ پیروں تلے سوکھے پتے کُرلانے لگے تھے اور درختوں پہ لگے زرد پتے ان سے الوداعی سرگوشیوں میں لگے تھے۔رات کے پچھلے پہر ہم کوالالمپور جانے کے لئے سری اسکندر سے نکل آئے تھے۔ میں نے اندھیرے میں ڈوبے سری اسکندر کو خدا حافظ کہا۔ میں نے زندگی کے بہت خوبصورت دن یہاں گزارے۔

الوداع سری اسکندر، الوداع اے سبز باغوں کی زمیں۔ الوداع

الوداع پاموں کی نگری۔ الوداع

کوالالمپور ائر پورٹ پر وہی رونق تھی۔ رات یہاں بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ وقت مٹھی میں سے ریت کی مانند پھسل گیا تھا۔ میں نے اپنی ہتھیلی کو دیکھا! جہاں بیتے دنوں کی ریت کے ذرے چمک رہے تھے۔ جی بھر کے اپنی بیٹی اور پھر اس کی بیٹی کو دیکھا۔ بیٹی سے جڑے رشتے کو

گلے لگایا۔ جی بھر کے انہیں پیار کیا۔ چھلکتی آنکھوں پہ ضبط کے پہرے بٹھائے اور ۔۔۔ ٹرالی گھسیٹتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

جی چاہا مڑ کے دیکھوں مگر ۔۔۔ آنکھوں سے درد چھلک جانے کے ڈر سے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

اس پگڈنڈی پر چلتے چلتے ماربل کے پھسلواں فرش پر دھیرے دھیرے پاؤں دھرتے ہوئے میں ۔۔۔ شاید بہت آگے چلے آئی تھی۔ پھر رہا نہ گیا اور میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جہاں زندگی اپنی تیز رفتاریوں کے ساتھ رواں تھی۔ مُجھے الوداع کہنے والے اب کہیں نظر نہ آتے تھے۔ ادھر اُدھر بہت سے اجنبی چہرے دکھتے تھے۔ کچھ شگفتہ شگفتہ سے بعد کچھ رنجیدہ سے تھے اور کچھ ۔۔۔ میری طرح نم دیدہ ۔۔۔ نم دیدہ سے تھے۔

جہاز نے اڑان بھر لی تھی۔

جہاز سینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر محو پرواز تھا۔ سامنے مونیٹر پر ۔۔۔ زمینی رفتار کے مطابق ۔۔۔ ہزاروں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر جاری تھا۔ نقشے کی نشاندہی کرنے والا ننھا سا تیر ۔۔۔ کبھی انڈیمان کے جزائر کی طرف گھومتا اور کبھی ۔۔۔ سمندر کے اس پار کا اشارہ کرتا نظر آتا ۔۔۔ میری سوچ کے قافلے واپس اپنے گھر کی سمت رواں ہونے کے باوجود پیچھے کی طرف بھاگتے اور سری اسکندر میں بسنے والوں کی یاد میں الجھ جاتے۔

میں نے کھڑکی کے شیشے پہ آنکھیں رکھ دیں۔

باہر بادلوں کی دنیا تھی ۔۔۔ ہلکے سرمئی اور کہیں گہرے سیاہی مائل اور کہیں سفید ۔۔۔ دودھیا ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے یہ بادل ۔۔۔ بحرِ ہند پہ سایہ فگن ہو کر ۔۔۔ کرہ ارض کے تیسرے بڑے پانی کے ذخیرے کو ڈھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں بچپن سے یہ سنتی ۔۔۔ پڑھتی آئی تھی کہ ۔۔۔ زمین کا تین چوتھائی حصہ پانیوں

میں گھرا ہوا ہے مگر۔۔۔۔تب مجھے اس بات کا یقین ہی نہیں آتا تھا۔۔۔۔مجھے تو اپنے چاروں طرف زمین ہی دکھائی دیتی تھی۔پہلی بار۔۔۔۔نیلے پانیوں کا ذخیرہ میں نے کراچی میں دیکھا تھا اور سمندر کی تلاطم خیز موجوں کو دیکھ کے حیران رہ گئی تھی اور اب۔۔۔۔اتنے ڈھیر سارے دن ملائیشیا کے ساحلوں پہ۔۔۔۔جھیلوں اور آبشاروں کی سیر کرنے میں گزارے تھے اور پانی کی وسعتیں دیکھ لی تھیں۔

مجھے ایشل یاد آنے لگی تھی۔اس بار میرے ساتھ ایک بنگلہ دیشی نوجوان بیٹھا تھا۔

مسافروں کی سرگوشیاں قدرے مدھم پڑ گئی تھیں اور میں اپنے اس ہم سفر سے رُخ موڑے۔۔۔۔جہاز کی کھڑکی سے لگی گم صم بیٹھی تھی۔میری آنکھوں میں جگنو چمکنے لگے تھے۔محبتیں قطرہ قطرہ میری آنکھوں سے پگھلتی ہوئی جہاز کی چھوٹی سی کھڑکی کے چوکھٹے میں جذب ہونے لگی تھیں۔ملائیشیا آنے اور وہاں قیام سے لے کر واپسی تک کے لمحات میرے سامنے تھے۔

ملائیشیا آنا میرا وہ خواب تھا جو۔۔۔۔میں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔جسے رب کریم نے بن دیکھے۔۔۔۔بن مانگے ہی پورا کر دیا تھا۔

جہاز میں برتن کھنکنے لگے تھے۔کھانا کھل گیا تھا۔اضطراب بڑھ گیا تھا۔کُھسر پُھسر ہونے لگی تھی۔ٹرالی کچھ دیر میرے پاس بھی رُکی مگر میں آنکھیں موندے رہی۔

جی ہی نہ چاہا کچھ کھانے کو۔

ائیر ہوسٹس کے ٹرالی آگے لے جاتے ہی میں نے آنکھیں کھولیں مگر۔۔۔۔جہاز سے باہر دیکھنے کی کوشش نہ کی۔باہر وہ دبیز بادل بھی اب کے مُجھے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے تھے جن سے بہت اوپر۔۔۔۔بہت اونچائی پہ اُڑتا ہوا یہ جہاز دریاؤں۔۔۔۔سمندروں۔۔۔۔غاروں۔۔۔۔پہاڑوں سے گزرتا ہوا پاکستان کی طرف بڑھتا جاتا تھا اور میرا دل ثروت حسین کی اس نظم میں اُلجھ کے رنجیدہ۔۔۔۔اور رنجیدہ ہوا جاتا تھا۔

گئی گزری یادیں

گئی گزری یادوں کے کوزے میں پانی
کسی کی نشانی
گئی گزری یادوں کی اک لٹ
گئی گزری یادوں کی چوکھٹ
دریچے کے دوپٹ
گئی گزری یادوں کا ہر پل
نمودار جنگل
گئی گزری یادوں کا دلکش زمانہ
گئی گزری یادوں کی خوش کن نفیری
طلسمِ اسیری

مجھے اس دیس جانا ہے

تسنیم کوثر اب ادبی دنیا کا جانا پہچانا نام ہے۔اس کا اولیں تعارف شاعری کے ذریعے ہوا۔ان کی شاعری میں اتنی کشش تھی کہ شعری ذوق رکھنے والوں نے اس کی بہت تحسین کی۔ ساتھ ہی ان کے افسانے شائع ہونے لگے اور پڑھنے والوں کو معلوم ہوگیا کہ وہ بیک وقت شعرگوئی اور افسانہ نگاری پر دسترس رکھتی ہیں۔ شاعری اور افسانے میں انھوں نے اپنے مشاہدے کو بنیاد بنایا اور اسے حقیقی تجربہ بنا دیا چنانچہ انھیں شاعرہ اور افسانہ نگار کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا۔

چند سال سے انھوں نے شعرگوئی اور افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ سفرنامہ نگاری کی طرف بھی توجہ مبذول کی ہے۔ان کے سفرنامے رسائل میں قسط وار طبع ہونے لگے تو اندازہ ہوا کہ وہ اس صنفِ ادب میں بھی ممتاز حیثیت حاصل کریں گی۔

ان کا پہلا سفرنامہ ''کہانی ان دنوں کی'' ہندوستان کے سفر کے مشاہدات اور تاثرات پر مشتمل ہے جسے بہت پسند کیا گیا۔پھر ''جہاں رحمت برستی ہے'' کے عنوان سے سرزمین حجاز کا سفرنامہ قسط وار شائع ہونے لگا اور موضوع کی مناسبت سے اس کی بھی بہت پذیرائی ہوئی۔پھر انھیں مشرقِ بعید کے حسین ملک ملائیشیا میں جانے کا موقع ملا تو وہاں انھوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اسے بھی سچے حقیقت نگار کی حیثیت سے لکھ ڈالا۔ان کا یہ سفرنامہ اشاعتی مراحل سے گزر کر اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

تسنیم کوثر شعر کہیں یا نثر لکھیں انھیں لکھنے کا ہنر آتا ہے۔یہ قدرت کی دین بھی ہے اور اسے اس نے مطالعے سے بھی جلا بخشی ہے۔ان کے اسلوب میں مجموعی طور پر سادگی ہے۔ وہ مختلف کتابوں سے الفاظ اکٹھے کر کے جملوں میں استعمال نہیں کرتیں بلکہ روانی سے لکھتی چلی

جاتی ہیں۔ان کی نثر میں شاعرانہ اسلوب کی جھلک تو ہے مگر تکلف اور تصنع کا بالکل احساس نہیں ہوتا۔

سفرنامہ نگار جہاں بھی جائے اور جہاں سے بھی گزرے وہ ان مقامات کو خارجی انداز میں بھی دیکھتا ہے اور اپنے ذاتی زاویۂ نظر سے بھی مشاہدے کو احساس کا رنگ دے دیتا ہے۔پھر یہ بھی ہے کہ وہ اس ملک کا تقابل اپنے ملک سے بھی کرتا چلا جاتا ہے۔مثلاً اس اجنبی خطۂ زمین اور ہمارے منظرنامے میں کیا نمایاں فرق ہے؟ افراد کی شکل شباہت، پوشاک، خورونوش، رہن سہن، تہذیب و ثقافت وغیرہ میں کتنا اختلاف اور کتنی مشابہت ہے۔سفرنامہ نگار مرد ہو تو اس کا زاویۂ نظر خاتون سفرنامہ نگار سے بعض معاملات میں الگ ہوگا۔تسنیم کوثر نے ملائیشیا جیسے ابھرتے ہوئے ملک سے جو تاثرات اخذ کیے ہیں ان کو بڑے دلچسپ، اسلوب اور باریک بینی سے تحریر کیا ہے۔مبالغہ آمیزی سے اجتناب کیا ہے۔جو لوگ کبھی ملائیشیا نہیں گئے ان کے سامنے اس ملک کا پورا مرقع آجاتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ کاوش ان کی دیگر تحریروں کی طرح پسند کی جائے گی اور ہر مزاج کے پڑھنے والوں کے لیے دل نشین اور دلکش ہوگی۔میری خواہش ہے کہ وہ ایسی ہی عمدہ تحریریں لکھتی رہیں تاکہ ہم اُن سے لطف اندوز اور مستفید ہوتے رہیں۔

خواجہ محمد زکریا
پروفیسر امیریٹس (اردو)
پنجاب یونیورسٹی۔لاہور

اردو سفرناموں میں ایک قابلِ قدر اضافہ

تسنیم کوثر اب ادبی دنیا کا جانا پہچانا نام ہے۔ان کا اولیں تعارف شاعری کے ذریعے ہوا۔ان کی شاعری میں اتنی کشش تھی کہ شعری ذوق رکھنے والوں نے اس کی بہت تحسین کی۔ ساتھ ہی ان کے افسانے شائع ہونے لگے اور پڑھنے والوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ بیک وقت شعر گوئی اور افسانہ نگاری پر دسترس رکھتی ہیں۔ شاعری اور افسانے میں انھوں نے اپنے مشاہدے کو بنیاد بنایا اور اسے حقیقی تجربہ بنا دیا چنانچہ انھیں شاعرہ اور افسانہ نگار کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔ چند سال سے انھوں نے شعر گوئی اور افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ سفر نامہ نگاری کی طرف بھی توجہ مبذول کی ہے۔

تسنیم کوثر شعر کہیں یا نثر لکھیں انھیں لکھنے کا ہنر آتا ہے۔ یہ قدرت کی دین بھی ہے اور اس صلاحیت کو مطالعے نے بھی جلا بخشی ہے۔ ان کے اسلوب میں مجموعی طور پر سادگی ہے۔ وہ مختلف کتابوں سے الفاظ اکٹھے کر کے جملوں میں استعمال نہیں کرتیں بلکہ روانی سے لکھتی چلی جاتی ہیں۔ان کی نثر میں شاعرانہ اسلوب کی جھلک تو ہے مگر تکلف اور تصنع کا بالکل احساس نہیں ہوتا۔

تسنیم کوثر نے ملائیشیا جیسے ابھرتے ہوئے ملک سے جو تاثرات اخذ کیے ہیں ان کو بڑی دلچسپی، تنوع اور باریک بینی سے تحریر کیا ہے۔ مبالغہ آمیزی سے اجتناب کیا ہے۔ جو لوگ کبھی ملائیشیا نہیں گئے ان کے سامنے اس ملک کا پورا مرقع آجاتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ کاوش ان کی دیگر تحریروں کی طرح پسند کی جائے گی اور ہر مزاج کے پڑھنے والوں کے لیے دل نشین اور دلکش ہو گی۔ میری خواہش ہے کہ وہ ایسی ہی عمدہ تحریریں لکھتی رہیں تاکہ ہم اُن سے لطف اندوز اور مستفید ہوتے رہیں۔

خواجہ محمد زکریا

پروفیسر امیریٹس (اردو)

پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

اردو اکیڈمی، پاکستان، لاہور

تعبیر فاؤنڈیشن، لاہور